اذان

…قبال کی نظم کا تخلیقی مطالعہ

احمد حسین

اذان

اقبال کی نظم کا تخلیقی مطالعہ

احمد حسین

جُملہ حقوق محفوظ ہیں

پہلی طباعت : 1999ء

نام کتاب : اذان-اقبال کی نظم کا تخلیقی مطالعہ

مصنّف : احمد حسین

قیمت : -/150روپے

مطبع جے۔کے۔ آفسیٹ پرنٹرز 315، جامع مسجد، دہلی-6

کمپوزنگ: تاج کمپیوٹر گرافکس 3151، ترکمان گیٹ، دہلی-6

کتاب ملنے کا پتہ:

D/42، گُل موہر پارک، نئی دہلی-49

آوازۂ برق آسا، اک شعلۂ وجدانی
اک ما عقہ خفتہ کو، تحریک ز نورانی

پیش لفظ

ایک تو مزاج ہی پیش لفظ وغیرہ کو خود نوازی کے مرادف سمجھتا ہے دوسرے قلم انتہا سے زیادہ بد خصال۔ آسمان سے بہکا تو زمین پے پہنچ گیا۔ اور منھ زور ایسا کہ بہکتا ضرور ہے۔

چنانچہ زیر نظر تحریر کے لیے دل پے جبر کر کے پیش لفظ ترتیب دینے لگا تو ہوتے ہوتے نظم کے تعارف کے بجائے اردو کی حیات و ممات کے عنوان پر پورا ایک مضمون بن گیا۔ مرثیہ بھی، مناقب بھی۔ اتنا طول کہ پناہ بخدا۔ اطراف ہی اطراف، ابعاد ہی ابعاد۔ ایک مختصر نظم کے بارے میں منضبط تحریر بھلا اس بار گراں کو کیسے اٹھا سکتی تھی۔

ترک کرنا پڑا اس سلسلے کو۔ اب اگر وہ مکمل ہو گیا تو ان مضامین میں ایک اور اضافہ ہو جائے گا جو طلب گار طباعت میرے کاغذی ہمالے میں جمع ہوتے جا رہے ہیں۔

اس لیے حرف دو حرف کا وہی قرض اب بھی باقی رہ گیا پیش نظر تحریر کے تعارف کا۔

مگر اب ایک دم سے اتنی باتیں کہنے کی اُبلی آ رہی ہیں کہ جی گھبرا رہا ہے اور یقین ہے کہ گھبراہٹ میں کچھ بھی نہیں کہہ پاؤں گا۔

خیر

کچھ نہ کہوں پر میرے ذمے آپ کا جو قرض ہے وہ تو تھوڑا بہت ادا ہی

کردوں اس معروضے کے ساتھ کہ آپ کا شکر گزار ہونے سے بھی پہلے مجھے تعجب ہے آپ کی دلیرانہ یکتائی پے کہ آپ نے ایسی مانع اور قاطع اور ناکشش تصنیف سے نبرد آزمائی کا بیڑا اٹھایا ہے وہ بھی اس دور میں جبکہ شاید آپ لاکھوں میں ایک ہوں۔

مگر آپ چاہے لاکھوں میں ہوں یا کروڑوں میں ایک ہوں، مجھے اس بدکلامی سے باز نہیں رکھ سکتے کہ اگر یہ کتاب آپ نے اپنی خوش عقیدگی اور اسلامی جوش میں اٹھائی ہے، یہ سمجھ کر کہ اذان کے بارے میں ہے تو اس کو پڑھنے میں ہمارے نامہ اعمال میں کچھ نہ کچھ ثواب تو ضرور لکھا جائے گا، تو پھر رکھ دیجئے اسے، یہ کتاب آپ کے لیے نہیں ہے، نہ آپ کے بس کی ہے۔

کیوں کہ اس کو دینی وعظ یا عبادت کے احکام و شرائط یا اسلام کی عظمت سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔

اچھا ہے یا برا ہے، یہ تو بعد کی بات ہے، پہلی بات یہ ہے کہ یہ صرف ایک ادب پارہ ہے، صرف آپ کی ادبی حس، آپ کے ذوق نظر کو اپیل کرنے کے لیے۔

اور یاد رہے، ادب کا مرکزی عنصر حسن کاری ہے، وہی حسن کاری جسے ارباب غلوسیہ کاری پر محمول کرتے ہیں۔

اس لیے آپ اب بھی اپنے ذوق عصیاں نوازی سے تائب نہ ہوئے ہوں تو گزارش ہے کہ اس کتاب کو اگر روانی کے ساتھ پڑھیں گے تو زیادتی اس کے ساتھ بھی ہوگی اور خود آپ کے ساتھ بھی۔

مراد یہ ہے کہ اسے آگاہی و بیداری کے ساتھ، ناقدانہ سخت گیری کے ساتھ، تامل کے ساتھ، رک رک کے، ٹھہر ٹھہر کے، لفظ لفظ پے اور ان کے درمیانی خلاؤں پے غور کر کے پڑھیے۔

لیکن کتاب کو بصیرت افروزی کا کوئی دعویٰ نہیں، نہ یہ عقل و دانش کو متحرک کرنے کی دعوت ہے۔ یہ تو صرف آپ کے حریم قلب تک پہنچنے اور آپ کے وجدان کو مس کر لینے، اس میں ایک جنبش، ایک لرزش سی پیدا کر دینے کی کوشش ہے۔

اور یہ کوشش ناقص ضرور ہوگی، لیکن مجھے اس کے نقص کا کوئی افسوس نہیں۔

کیوں کہ قلم کی سرگشتگی کی نہ شکایت ہے نہ ملال۔

گلِ سنگ، ڈی ۴۲ گل مہرپارک
نئی دہلی۔ ۴۹

احمد حسین
۲۹ر جون ۱۹۹۸ء

افلاک کی منزل سے نوری کا سوال آیا
دانش گہ آدم سے دانا کا جواب آیا

آج ۱۹۹۸ء کی بھی پہلی تاریخ ہے اور رمضان المبارک کی بھی۔ دونوں جانب سے خوشی کی علامت، دین و دنیا گلے مل رہے ہیں۔

اقبال کی نظم "اذان" کے متعلق بعض خیالات عرصے سے ذہن میں گردش کر رہے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بھلی بری تحریر کی ابتدا آج ہی کر دی جائے، خاص طور سے اس لیے بھی کہ نظم کی رمضان کے ساتھ یک گونہ مناسبت بھی ہے جو مزید ترغیب دے رہی ہے۔ اذان ابتدا ہے عبادتِ عظمیٰ کی اور پہلی رمضان ابتدا ہے ایک سلسلۂ عبادات کی۔

مگر اتفاقی اور ظاہری ملاپ کی اس مناسبت جلی سے زیادہ مناسبت خفی قابلِ لحاظ ہے۔ اگرچہ نظم میں رمضان کا بذاتِ خود کوئی واضح ذکر نہیں لیکن دونوں کو متوازی کرنے والا ایک داخلی پہلو یقیناً موجود ہے اور وہی اہم بھی ہے۔

ممکن ہے نظم کے تمام گوشے یادداشت میں محفوظ نہ ہوں اس لیے کیوں نہ اسے ایک بار پھر سے پڑھ لیا جائے؟

اذان

اک رات ستاروں سے کہا انجم سحر نے آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار؟

کہنے لگا مریخ ادا فہم ہے تقدیر | ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار
زہرہ نے کہا اور کوئی بات نہیں کیا | اس کرمکِ شب کور سے کیا ہم کو سروکار!
بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی | تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار
واقف ہو اگر لذتِ بیداریٔ شب سے | اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پُر اسرار
آغوش میں اس کی وہ تجلی ہے کہ جس میں | کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار
ناگاہ فضا بانگ اذان سے ہوئی لبریز | وہ نعرہ کہ ہل جاتا ہے جس سے دلِ کہسار!

کل سات اشعار

شعر و شاعری کے معاملے میں عددی حساب کتاب بے جوڑ بد مذاقی معلوم ہوتی ہے لیکن اس پہلو سے بھی تھوڑا بہت تذکرہ کبھی کبھی مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

چنانچہ اس اعتبار سے نظم کے ارتقا میں مختلف مراحل کی تقسیم کیجئے تو عنوان سے وابستہ اصل موضوع پر تو صرف ایک شعر ہے۔ آخری۔ باقی چھ میں پیش بندی کی گئی ہے کہ اس منزل تک رسائی ہو جائے۔

اس پیش گفتار میں بھی اوّل کے تین شعر ستاروں کے اقوال ہیں اور بعد کے تین میں چاند کا بیان ہے۔ ستاروں میں پہلا نام نجم سحر کا آتا ہے جو سوال کی شکل میں گفتگو شروع کر دیتا ہے۔ باقی دو میں ستارے کہنے کے لیے تو گویا اس سوال کا جواب ہی دیتے ہیں لیکن اپنے اپنے تبصرے میں اس شدت سے نمک مرچ ملاتے ہیں کہ لگتا ہے جواب کے بہانے دل کی بھڑاس نکال رہے ہیں۔

نظم گردش کرتی ہے سحر خیزی کے موضوع کے گرد۔ ستاروں کے بیانات تمام تر "شب بیداری" کے ذکر پر منحصر ہیں جو دراصل سحر خیزی ہی کا ایک پہلو ہے۔

اب یہ بحث جو ستاروں نے چھیڑی ہے یوں تو تمام مدتِ حیات کو اپنے دامن

میں سمیٹے ہوئے ہے، لیکن رمضان میں شب بیداری کی سرحد سحر خیزی سے سچ مچ اس طرح مل جاتی ہے کہ ایک جاری استمرار بن کے دونوں ایک ہو جاتی ہیں۔

نظم کو سرسری طور پر پڑھنے سے بھی یہ خیال بہر حال گزرتا ہے کہ شب بیداری کے فقدان کو بہانہ بنا کر انسان پر جو تیر اندازی ہو رہی ہے اس کا رمضان کی راتوں میں پورا دفاع موجود ہے اور جب رات کی مصروفیت اذان بن کر اپنے نقطۂ کمال پر پہنچے گی تو اس کی آواز اس نکتہ چینی کا بھی مسکت ازالہ بن جائے گی جو آدم بیزار ستارے بعد میں کرتے رہے ہیں اور اس استفسارِ اوّل کا بھی جواب آجائے گا کہ

آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نہ کبھی بیدار

ہاں، دیکھا کیوں نہیں، آ کر تو بھی دیکھ لے جستجو گرد ستارے کہ صلاۃِ شب یا تراویح سے لے کر صبح کی نماز تک شب بعد شب آدم کا طرز حیات بیداری ہی بیداری ہے۔

استعارۂ ناسزا

اور اے مریخِ بد گہر! رمضان میں آ اور مرکوز کر اپنی نظر اس آدم پہ جسے تو نے "چھوٹے سے فتنے" کے لقب سے یاد کیا ہے کہ نماز کی منزلِ سجود کی معراج ہی کے وقت نہیں، بلکہ قیام کی منزلِ اول میں بھی اس کا قد فرشتوں سے فزوں ہے۔ بھلا ایسی ہستی کے لیے تو نے ایسا بے ادبی کا کلمہ استعمال کیا ہے کہ اس لقبِ ناسزا کو اس انگریزی مثل سے مماثل کر دیا ہے جس میں خطرۂ خوابیدہ کو سوتے ہوئے کتّوں کے استعارے سے ظاہر کیا جاتا ہے۔ رمضان کی سعادت اگر تجھے بھی توفیقِ نیک عطا کرے تو اپنی چشمِ بد میں اس نظر نواز منظر سے بصارت و بصیرت کی دولت حاصل کر لے کہ انسان بیدار بھی ہے اور اس کی بیداری فتنہ خیز بھی نہیں، بلکہ سراسر نیکی، سراسر ثواب ہے۔ انسان فتنوں کا سرچشمہ نہیں بلکہ ان کو فرد کرنے والا کردارِ صالح اور فردِ سلامتی ہے۔

اور آدم کو "کرمِک شب کور" کہنے والی زہرہ! تیری آنکھیں پھوٹی ہوئی ہیں ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ تجھے نظر نہ آئے کہ آدم بیدار بھی ہے دیدہ ور بھی ہے۔

مصرع بہ مصرع نظم کو پڑھتے چلے جایئے اور آپ کا ذہن ستاروں کی تنقید کو رمضان کے سیاق و سباق میں خانہ بہ خانہ رکھتا چلا جائے گا اور نکتہ بہ نکتہ ان کے سارے کلمات کے جواب دل ہی دل میں آپ کے اندر خود ہی اترتے چلے جائیں گے۔

اب اگر آپ کہیں کہ واہ صاحب واہ! نظم کا بعید سے بعید ربط بھی ہوتا رمضان سے تو شروع سے آخر تک سوتے رہنے کا یہ رونا ہی کیوں ہوتا۔ تو میں تعرض نہیں کروں گا بلکہ عرض کروں گا کہ جی ہاں بجا فرمایا، میں بھی یہی کہتا ہوں۔ لیکن جب میں نے عرض کیا کہ نظم کے ایک ایک جزو، ایک اک مصرعے سے رمضان کی طرف خیال جاتا ہے تو اس سے مراد براہ راست اور ظاہری ربط سے نہیں بلکہ اس ربط سے تھی جو کسی مطلق ضد میں مضمر ہوتا ہے۔ یعنی جس طرح آج کل سردی کی شدت کی وجہ سے از خود گرمی کی طرف خیال جاتا ہے جس طرح پہاڑ جب یہ کہہ کر اظہارِ اطمینان کرتا ہے کہ "آتی ہے کوہ سے سدا زندگی ہے سکون میں"

تو ذہن فوراً حرکت و جنبش کی جانب مائل ہو جاتا ہے اور معاً یاد آجاتا ہے کہ نوشۂ رقص نے اس کا کیا توازن بخش جواب دیا تھا: "کہتا ہے مورِ ناتواں لطفِ خرام اور ہے۔"

ایک اندازہ ہے، ممکن ہے صحیح ہو، کہ نظم لکھنے میں شعور کی بالائی سطح پر نہ سہی، مگر اقبال کے ضمیر میں اذان کا یہ پہلو کہیں نہ کہیں موجود رہا ہوگا کہ اذان سحر خیزی کو شب بیداری سے ملانے والی وہ علامت ہے جس کا یہ سنگم نما عمل رمضان میں خاص طور سے نمایاں ہو جاتا ہے۔

اب اگرچہ ستاروں کے خروش اعتراض و مخالفت کو خاموش کرنے یا کم سے کم انھیں سمجھانے اور مطمئن کرنے کے لیے مہِ کامل سے کہلوانا پڑا کہ

تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار

مگر غور کیجئے تو یہ بھی ایک ایسا اندازِ وکالت ہے جو نظم کی اصل روح کو برافگندہ نقاب نہیں کرتا بلکہ ایک حسین حیلے سے اس کی پردہ داری کرتا ہے۔

کہلوانا تو چاند کے وسیلے سے اصل میں یہ ہے کہ تم تو مدتِ شب کی تنگی میں جکڑے ہوئے ہو۔ تم انسان کے نظامِ شہود و نمود کو نہیں سمجھ سکتے۔ تم وقت ہی کی نہیں بلکہ مقام کی قید میں بھی ایسے گرفتار ہو کہ اپنے زندانِ فلک کے اندر بندھی ہوئی حالت میں انسان کے مسکن سے نابلد رہنا تمہاری قسمت کی مجبوری ہے۔ میں تمہاری طرح ساکن و مجبور نہیں بلکہ محوِ خرام ہوں۔ تمہاری طرح نہ زمان کا پابند نہ مکان میں اسیر۔ تم کو یہ توفیق بھی عطا نہیں ہوئی کہ اپنے دائرۂ حبس سے قدم نکال کر کبھی ارض آدم کی رنگارنگ مشاطگی کی زیارت کرتے تاکہ تمہیں اندازہ ہوتا کہ جس کا مکان اتنا حسین و دلکش، اتنا عظیم و تابناک ہو، اس کا مکین کیا برقِ پایندہ، کیسا ستارہ کش آفتاب ہوگا۔

"ارے چھوٹے چھوٹے تارو جو (فی الحال کہیں کہیں) چمک دمک رہے ہو"

یہ نہ سمجھنا کہ میری جانب سے انسان کی یہ ثناخوانی کوئی حوالہ حدیث دیگراں ہے۔ نہیں، یہ سب کچھ اور اور بہت کچھ، میرا اپنا ذاتی تجربہ اور عینی مشاہدہ ہے۔ خدا اور انسان دونوں کی سجائی ہوئی جس زمین پر انسان نے اپنی گرمیٔ حیات کی بساط قائم کی ہے میں خود، اپنی روشن جبینی کے باوجود، اور باوجود اس افتخار و امتیاز کے کہ میری ضیائے معتدل، سکونِ جسم و جاں ہے اور بے چہرہ آسمان کے لیے شناخت بھی ہے اور آبرو

بھی، پھر بھی انسان کی مادرِ گیتی کا مسلسل طواف کر رہا ہوں، رات ہی کو اس پر نچھاور نہیں ہوتا بلکہ دن کو بھی، جب میری عروس سامانی خاصی ماند پڑ جاتی ہے، میں اس پر قربان ہونے کے پاکیزہ فرض سے غافل نہیں ہوتا۔

باقی ہے بیاں اور

اور دیکھو، میں تمھیں پھر یاد دلادوں کہ یہ سب کچھ جو میں نے کہا بہت کم ہے۔

کیوں کہ بس اتنا ہی تو کہا نا کہ "تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار۔"

مگر تمھاری اور اس کی نمود میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ تمھارا سلسلۂ آفاق کیا ہے؟ بس ایک سل ہے کالی کالی سی۔ اور تم کیا ہو؟ اسی سل پے مٹی مٹی سی روشنی کے بکھرے ہوئے بے نیل و نظام نقطے، ایسے بے بضاعت و کم سواد کہ تم میں سے ہر ایک کے لیے شاعر کو، معمولی شاعر نہیں بلکہ تمھاری سمتِ اوّل کے نقیب یعنی شاعرِ مشرق کو کہنا پڑا کہ

وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں!

اور انسان؟

ابھی طفلک نا پختہ ہے، مگر پھر بھی ترتیب و تضمین کا امام، ترمیم و تنسیخ و تصحیح و تصنیف کا بادشاہ، ایجاد کا موجد اور طلوعِ پیہم اور فرازِ اکمل!!

خبردار اس وہم میں مبتلا نہ ہونا کہ نمود و ظہور میں مشترک ہونے کی وجہ سے تم اس کے مساوی ہو گئے۔

ارے نمود سے بھی پہلے تو منزل وجود کی ہوتی ہے مگر وجود اور وجود ہر ایک کا برابر ہو سکتا ہے بھلا؟ وجود تو سب سے پہلے اللہ کا ہے لیکن وہ واجب الوجود اور اور سب ممکن الوجود۔ ممکن واجب کی ہم سری تھوڑی کر سکتا ہے۔ اور اس علوئے اعلیٰ سے اتر کر بھی جستجو کرو تو نتیجہ تمھارے نہیں آدم کے حق میں نکلتا ہے۔

علم کا موجود اور فقر کا موجود اور

اشہدان لاالہ ، اشہدان لاالہٗ

تم کیا مقابلہ کرو گے بھلا نمودِ آدم کا!

برا نہ مانو تو کہہ دوں کہ تمہاری نمود تو بس نمائش ہے چشم تماشا کے لیے اور انسان کی نمود وہ ہے جس کی پہلی منزل کا اشارہ ملتا ہے گہر آبدار کی بے باک پردہ دری میں

ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا

یہی منزل حدیثِ الوہی میں سجود کرو بیاں سے عبارت ہے!!

نمود و شہود

یہ نمود محض ایک باب نہیں ہے کسی دید وا دید کا بلکہ کلی کے نمو کی مثال ہے کہ اندر سے چیخ کر کھل جاتی ہے۔ باطن کا ایک زور، ایک شورش ہے، داخلی، جو بالآخر حقیقت کو برافگندہ نقاب کر دیتی ہے، ایک بارود ہے جو خارج کے خول کو شق کر دیتا ہے اور سجودِ ملائک کی طلعتِ تمام کو ہویدا کر دیتا ہے۔ دراصل یہ نمو رصرف نمود نہیں، حقیقتاً شہود ہے، شہود ہے اور شہیدِ شہود بھی، کیوں کہ یہ تو ودیعت ہے شاہدِ ازل کی اور اس لئے الوہی سرحدوں تک جست خیز ہے اور مواج!

بے ذوق نمود زندگی موت ہر ذرہ شہیدِ کبریائی

ارے میرے خود بیں عزیزو، انسان وہ دانائے رمز ہے کہ اسے تمہاری حیثیت بھی معلوم ہے۔ تمہارے مایۂ کوتاہ نے جو لرزش اور کپکپی تمہارے اوپر طاری کر رکھی ہے اس کا راز بھی وہ بخوبی جانتا ہے۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

اور اس منزلِ کمال سے اس کا قرب یہ بھی بتا رہا ہے، اگر تم کنائے اور اجمال کے اشارے سمجھ سکو، کہ انسان سے خود میرے لگاؤ کی نوعیت کیا ہے جو مجھے اس کا

گرویدہ بنائے ہوئے ہے۔

مہ کامل کا کلام ابھی جاری ہے۔

لیکن درمیان میں ایک جملۂ معترضہ ضروری ہے، طویل ترجملہ، ان تمام شبہات و شکوک کے ازالے کے لیے جن کے پیدا ہونے کا امکان یہاں پہنچتے پہنچتے قوی معلوم ہونے لگا ہے۔

محفلِ ثابت و سیار میں یہ بہ ظاہر دل پذیر و مطبوع خطابت کہیں محض مصنف کی قیاس آرائی، ذہنی پرواز اور صرف متاثر کرنے کے مقصد سے کی ہوئی بے بنیاد قلم جنبانی تو نہیں ہے؟ محض رعب جمانے کے لیے زبردستی کی نکات آفرینی؟

اگر ایسا ہوتا تو بات ایسی فطری نہ ہوتی کہ دل اُسے خود بخود قبول کرتا چلا گیا، اس کا غیر فطری انداز وہیں کھٹکنے لگتا۔ کوئی ادراک جو حساس ہو خارج کی بے محل موشگافی کو انگیز نہیں کیا کرتا۔

لیکن یہاں خطیبِ شب کی سخن سنجی کا انداز، بالخصوص اس کی سہل اور بے تکلف روانی، خود گواہ ہے کہ یہ بیان میرا تسویدہ و آفریدہ نہیں، بلکہ از خود بالیدہ واز خود دمیدہ ہے۔

تصدیق ہو جائے گی اگر ایک نظر چاند کی گفتگو کے سیاق و سباق پے ڈالیے۔

ایک سرا تو یہ ہے کہ جو کچھ کہا وہ تو محض پیش بندی ہے، مقصد تو اس سے کہیں زیادہ فزون و گراں اور بلند بانگ ثنا خوانی کا ہے۔ بلند بانگ، کیوں کہ اس سے پیوست جو منزل ہے وہ گلبانگ عنادل کی نہیں، "ناگاہ فضا بانگِ اذان سے ہوئی لبریز" کی ہے۔ لیکن چھوٹتے ہی ایک دم اور اچانک اس ملاء اعلیٰ تک جست لگا دینا تہذیبِ فصاحت کے منافی ہے۔ اس لیے اس سے زیادہ مناسب اور موزوں شروعات اور

کیا ہو گی کہ پہلے انسان کو ان ستاروں کے ہم دوش تو کر دیا جائے جو اس وقت چاند کے مخاطب ہیں۔

تم بھی ہو نمودار تو وہ بھی ہے نمودار

بس فرق یہ ہے کہ

تم شب کو نمودار ہو وہ دن کو نمودار

اور یہ ستارے، یہ مخاطب کون ہیں؟ بیشتر اُس گروہ کے رکن جو انتہائی خود نگر اور کبارت زدہ واقع ہوا ہے، کوئی انسان کو خوابیدۂ خمار ازلی کہہ رہا تھا، کوئی اسے بے بصر کیڑے کے اسم کریھ سے یاد کر رہا تھا، کوئی اس کا نام آیا تو کانوں پے ہاتھ رکھ کے توبہ کر رہا تھا: ارے وہ! وہ تو فتنہ ہے، غضب کا فتنہ۔ پھر فتنہ ہونے کے ساتھ چھوٹا بھی، خدا کی پناہ کہ کوئی چھوٹا ایسا بڑا فتنہ بن جائے کہ بس فتنۂ دوراں کہلائے، ارے فتنہ کیا قہر بے قہر، قیامت ہی قیامت، عیاذاً باللہ.....!

ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار!!

اور یہ کون کہہ رہا ہے؟ جلّاد فلک، جو خود فتنۂ اعظم ہے۔

تو مستند ہو گئی نا انسان کی فتنہ گری۔ تمام وسعتِ افلاک میں سب سے معروف اور بدنام بانیٔ فتن کی خوف زدہ تصدیق۔ اب اس سے بڑھ کر سند انسان کی بدنہادی کی اور کیا ہو سکتی ہے، اس سے بڑا داغ اور دھبا اور کیا ممکن ہے؟

جم گیا نا یہ کلنک اس کے ماتھے پے؟ ہمیشہ کے لیے۔

بے شک جم گیا، بہ شرطیکہ اس کی یہیں، عین موقع پر تکذیب و تردید نہ ہو جائے۔

نظام بلاغت

اب داد دیجئے ماہِ منیر کی موقع شناسی کو، اور اس کے تحمل کو بھی، کہ اب تک وہ خاموش رہا، انتظار کرتا رہا، اور لب کشائی اس وقت کی جب پانی سر سے اونچا ہو گیا۔

اس نفسیات پر غور نہیں کیا آپ نے۔

ستاروں کے دریدہ دہن سے ایسی بے دریغ دشنام طرازی سرزد تو ہو گئی لیکن اب چہروں پے شرمندگی سے رنگِ شفق کی لہریں آپ نہ دیکھ پائیں تو کیا ہوا، میں تو بتا رہا ہوں راز درونِ پردہ کہ شورِ تنقیص کا ہنگامہ فرو ہوتے ہی پل بھر کی جو خاموشی ہوئی اس میں گلیاروں کے ذہن میں خود یہ سوال کھٹکنے لگا ہے کہ یار ہماری بدزبانی کہیں حد سے سوا تو نہیں ہو گئی؟

غور کیجئے میں کیا عرض کر رہا ہوں۔

ہر عمل کا ردِ عمل ہوتا ہے۔

اور عمل بھی معمولی نہیں بلکہ شدید ہو تو ردِ عمل چاہے خفیف ہو مگر ہو گا ضرور۔

یعنی بہ ظاہر چاند کی تقر پر گمان ہوتا ہے کہ ایک شناور دریا کے تیز و تند دھارے کے خلاف تیر رہا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ لہروں سے لہر جو ٹکرائی تو روانی کا رخ لمحے بھر کے لیے ذرا الٹ سا گیا اور تیراک تجربہ کار ہی نہیں سمجھدار بھی تھا اس لیے اس نے اس موافق وقفے کا انتظار کیا اور جب گریز کا وقت آیا تو اس نے اٹھا لیا پورا فائدہ۔ اطمینان کے ساتھ۔

مطلب؟

یہ کہ چاند نے ایک پل کی خاموشی کا موقع دیا کہ بس ایک لمحے ہی میں اپنی زیادتی کا احساس ان کے ضمیر میں کچھ ڈوب تو جائے۔

اور تب اس نے ابتدا کی خطبہ صدارت کی۔

اب ذرا آنکھ اٹھا کے دیکھئے کہ یہ کون اور کیا ہے جو ستاروں کی سبھا میں فراز صدارت پر مسند نشین ہے۔

جی نہیں، یہ روزمرہ کا گھٹتا بڑھتا ہوا چاند نہیں، مہ کامل ہے جناب، مہ کامل۔

اور جب آپ اس کے تحمل اور موقع شناسی کی داد دے چکے تو اس سے کہیں زیادہ گرم جوشی کے ساتھ داد دینی ہے اس کے حُسنِ بیان کی۔

یہ جو صدر نشین ہے اس کو یہ رتبہ و مقام کیسے ملا؟

یہاں نہ "سوز و تب و تاب اوّل" کی کوئی اہمیت ہے نہ "سوز و تب و تاب آخر" کی۔

تب و تاب کے بجائے یہاں صرف روئے تاباں کو دیکھا جاتا ہے اور درجہ و منصب کا فیصلہ صرف طلعت و تابش کی بنا پر ہوتا ہے۔

اسی لیے مہِ کامل کی تابندگی کے آگے روشنی کی یہ چھوٹی چھوٹی سی بندیاں سر بہ خم ہیں اور ماہِ منوّر کے حرف و صوت کی ابتدا ہوتے ہی توجہ تمام بن کر محوِ سماعت ہیں۔

سبحان اللہ، ماہِ کامل کی بلاغتِ کاملہ! بر محل و بے مثال!

متکلم کو بھی احساس ہے اور سامعین کو بھی معلوم ہے کہ چاند کا رتبہ ستاروں سے بہت بلند (۱) و اعلیٰ ہے اور ایک دفعہ کو اگر وہ ان کے تکبّر پے ستاروں کی سرزنش بھی کرتا تو بجا تھا، اُسے سنا بھی جاتا اور اس کی بات کو ماننا بھی پڑتا۔

لیکن ماہِ کامل کی سیلستِ بالغہ دیکھیے کہ نہایت پیار سے اور ایک ہم نفس، ہم صفیر کہ لہجے میں سمجھانے بلکہ منانے کا سا انداز اختیار کیا گیا ہے۔

---

۱ یہاں اپنی سائنسی معلومات کی مداخلت سے مذاکرے کو بدحظ نہ کیجئے۔ چاند کی نظام شمسی میں جو ثانوی حیثیت ہے یہاں اس کی بات نہیں ہو رہی بلکہ بات ہے چشم ظاہر اور چشم شاعر کے چاند کی، اس چاند کی جو چندا ماما، ہے بچوں کے لئے اور حُسن تمام جویائے زیبائی کے لئے۔

کہنا تو یہ تھا کہ خبردار! روک دو اپنے اس خروشِ تکفیر و ظلمت کو اور پہچانو کہ تم کس کے بارے میں بدکلامی کر رہے ہو، کیسی برگزیدہ ہستی کی شان میں گستاخی کر بیٹھے ہو۔

مگر بدکلامی کے بدلے بدکلامی چاند کو اپنے اعلیٰ مرتبے کے اعتبار سے ہرگز زیب نہ دیتی اور پھر اس کے ٹھنڈے مزاج سے بھی میل نہ کھاتی۔ جھگڑے رگڑے میں پڑنا، تصادم کے بھنور میں کود پڑنا، نزاع کو فروغ دینا، کسی بھی قسم کی تندی و ترشی یا برہمی کا رُخ اختیار کرنا۔۔۔ یہ باتیں اس کے پورے کردار کی ضد ہیں۔

چنانچہ مقصد گفتگو اگرچہ لہجے کی سختی کا تقاضہ کر رہا تھا مگر کہا تو صرف یہ، اپنے مقام اور اپنے باطن کی نیکی کو ملحوظ رکھتے ہوئے، کہ جوش میں مت آؤ میرے پیارو۔ تم کو اسی پر ناز ہے نا، اور میں یہ بھی کہنے کو تیار ہوں کہ بجا ناز ہے، کہ تم آسمان کے ان گنت اور بے نام قمقمے نہیں بلکہ انفرادیت کے حامل اور خصوصیت ساماں ہو، اور افلاک کی ناشناس یکسانی اور نیلگونی اور بے نشان بے کرانی تمھاری بدولت ہی معنویت اور وقعت اور بلندی اور بزرگی کی دعویدار بن جاتی ہے۔ مگر اے اربابِ خورد جسے تم نیچا سمجھتے ہو وہ بھی گرا ہوا قطعاً نہیں بلکہ وہ بھی ایک ستارہ ہے، اپنی قسم کا بالکل انوکھا ستارہ، تم آسمان کے تارے ہو، وہ ستارۂ ارضی ہے، ہمدوش انبیائے اعلیٰ و فوقِ کرسیٔ بیانِ بالا۔

بولامہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی

انسان کا تو کیا ذکر، خود زمین کے بارے میں اس قسم کے خیالات کہ زمین نیچی ہے، گری ہوئی ہے، کم تر ہے۔۔۔ یہ سب نظر کا فریب ہے، فہم کا اس سے بھی سوا۔ مکان و مکین، انسان اور زمین۔۔۔ ان کو باہم دیکھو۔ تمھاری چمک تمھارے مسکن کو، آفاق کی ظلمت زدہ وسعتوں کو بالشت بھر بھی روشن نہیں کر سکتی اور انسان کی

سیارگی سے تمام کرۂ ارض کبھی روشن کبھی روشن تر رہتا ہے۔

اس تصور میں مبتلا ہونا بھی تمھارے لیے مناسب نہیں کہ نمود یعنی بصارت افروزی میں انسان تم سے کم تر ہے۔ ارے بابا، تمھیں تو چمکنے کے لیے رات کی تاریکی درکار ہے اور اس کے نور و ظہور کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ آفتاب عالم تاب نصف النہار پے ہوتا ہے اور اس کا سیل نور ہر ایک روشن کو، بلکہ خود روشنی کو بے نشان بنا دیتا ہے۔ مگر ٹھیک اسی وقت انسان کا طالع تبارک اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ دمکتا دکھائی دیتا ہے۔

ہو چکی تحمید و تمجید، پہلی منزل پوری ہو گئی شاید، ہو گیا جواب ستاروں کے حرفِ ناسزا کا۔

مجال نہیں اب کسی کی کہ اگر مگر کے طور پر بھی ایک لفظ زبان سے نکال سکے۔

وقفہ

ایک اور

اس بار چاند کے سانس لینے کا

اور اس لیے کہ تاثیر پوری طرح دلوں میں گھر کر لے۔ مہِ کامل نے خود سلسلۂ کلام کو منقطع کیا اور محفل پے نظر ڈال کے دیکھ لیا کہ حاضرین قائل نہیں تو ساکت ضرور ہیں۔

تقریر کی اگلی منزل ایک اور توہم کو بھی زایل کر دیتی ہے.....

جب تنبیھ کی جاتی ہے کہ ہشیار رہنا اے نوریانِ نظر۔۔۔ آگ اور خاک کی رقابت کا مسئلہ تمھارے لیے بہت بڑے خطرے کا باعث بن سکتا ہے۔ تمھاری اقلیم سے بھی آگے ایک پاکھنڈی نے پہلے بھی یہی پاکھنڈ کھیلا تو آج تک اس کی سزا بھگت رہا

ہے۔ تم نے بھی اس کی طرح کہیں انسان کو دھول بن کر اڑ جانے والی بے جان اور بے حیثیت مٹی سمجھ لیا تو تم بھی بڑا نقصان اٹھاؤ گے۔ کیوں کہ انسان اگر خاک ہے تو بھی اندر سے کھوکھلی، محروم، بے روح و بے مرام خاک نہیں ہے بلکہ

خاکِ پر اسرار

ہے، وہ خاک جس کا باطن رموز و معانی سے ہی نہیں، خلاقیت سے بھی چھلک رہا ہے کیوں کہ اس کو اسرار کے خزانے خود صاحبِ اسرار نے عطا فرمائے ہیں۔

اور اب جو ستودہ صفات کی قصیدہ خوانی کی برکت نے ایک طلاقت عطا کر دی چاند کی گویائی کو، ایک بے مثال جوشِ بیان سے متصف کر دیا اسے، حسنِ سخن اپنے شباب پر پہنچ گیا اور روانی ہی روانی ہے اب تو قلزم تکلم میں انسان کی جانب سے ایک رجز پیہم کی خاطر.....

نوائے ضمیر الٰہی

.....کیوں کہ تکلم، اس کا اپنا تکلم، صرف اس کا ذاتی شنگ و آہنگ نہیں رہ گیا بلکہ.....

.....اب اس کی حرف افروزی کے توسط سے ایک اور عظیم تر نوائے سروش ہے جو اسکی زبان سے انسان کی عظمتوں کی نوا سنج ہو گئی ہے۔

لیکن اس کے ذکر سے پہلے دو ایک امر اور بھی توجہ طلب ہیں۔ آگے کے مقاماتِ عروج کی جانب قدم بڑھانے سے پہلے بہتر ہے کہ اک نگاہِ واپسیں پیچھے کی جانب ڈال لیں اور اُن تفصیلات کا احاطہ کر لیں جو چاند کی گفتگو کے آغاز کے وقت پیشِ نظر تھے۔

کیوں کہ ان ہی تفصیلات میں درجہ بدرجہ اور مقام بہ مقام بستگی باہم کا، معانقوں اور مصافحوں کا، بندش و ربط کا ایک سلسلہ مناسبتوں سے چھلکتا ہوا تعمیر ہوتا چلا

گیا ہے جو اقبال کے یہاں آرٹ کے کمال کا بڑا ہی نادر، بڑا ہی منفرد پہلو ہے۔

موقع نہیں کہ اقبال نے اپنی طویل اور طویل تر نظموں میں آرٹ کے ارتقا کا جو سفر طے کیا مثلاً شکوہ اور جواب شکوہ سے لے کر شمع و شاعر وغیرہ کی سطح تک اور پھر وہاں سے مسجد قرطبہ کے ایسے پختگی کے دور تک تو اس طویل نظم کی صنف کو الگ سے دیکھا جائے اور پھر پیش کیا جائے کہ ان نظموں کا آرٹ نوع بہ نوع ہونے کے ساتھ ساتھ ایک مجموعی حیثیت بھی رکھتا ہے جداگانہ۔۔۔ان کا فن اور اس کے محاسن، ان کی مرحلہ بندی اور ارتقا کاری، ان کی روانی اور ایک نیم سرمستی کی وجدانی کیفیت، ان کا ٹھہر ٹھہر کر بڑھنے والا تفکراتی آہنگ، بالائے شعور موسیقی اور زیر شعور غنائیت۔۔۔ کس طرح یہ ساری نظموں کو ایک ممتاز و مخصوص پیکٹ میں سمیٹ لیتے ہیں۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام نظموں کو ڈبہ بند کر کے مہر لگائی اور بس ہوائی جہاز کے لگیج ہولڈ میں ڈھکیل دیا۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک بہت ہی چھوٹی سی نظم "اذان" سے نمٹنے میں تحریر کس قدر ضخیم اور پر پیچ ہوتی جا رہی ہے تو بھلا طویل نظموں کو ایک دو کلمۂ خیر میں کیسے برطرف کیجئے گا جبکہ ایک ایک نظم اپنی جگہ ایک وسیع و عریض عالم ہے ندرت و طرفگی کا۔ بلکہ میں تو کہوں گا کہ حضور پوری پوری نظم کا کیا ذکر ہے شکوہ اور جواب شکوہ سے چلیئے تو ایک ایک بند، ایک ایک مصرع بلکہ ایک ایک فرد، ایک ایک ترکیب و تراش تفسیر خواہ اور مضمون طلب ہے۔

یہ لیجئے جواب شکوہ میں جب آپ اس منزل پر پہنچے:

کچھ جو سمجھا مرے نالے کو تو رضواں سمجھا
مجھ کو جنت سے نکالا ہوا انساں سمجھا

تو کیا بس واہ واکر کے نکل جایئے گا!؟ نہ رضوان کا تعارف، نہ جنت سے نکلنے کی تلمیح، نہ اس خاص منزل پے اس بیت کی موزونیت و برجستگی کا کوئی ذکر؟

ابھی میں کالج میں تھا (سائنس کا طالب علم) کہ شمع اور شاعر کی نظم اس قدر دل بستگی کا موجب بن گئی کہ "دوش می گفتم..... "سے" یہ چمن معمور ہو گیا نغمۂ توحید سے" تک پوری نظم از بر ہو گئی تھی اگرچہ یہ وہی زمانہ تھا جب میری نئی نئی سیاست خاص اقبال کی کشید کی ہوئی اسلامیت کی ضد اور اس سے بیزاری پر آ کے ٹھہر گئی تھی۔ لیکن اس اسلامیت سے لبریز ایسے ایسے اشعار ایسے ایسے اعجاز رقم مصرعوں کی سحر انگیزی سے قلب کیسے بے نیاز رہ سکتا تھا۔

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

اور

شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی

اسی میں وہ شعر آتا تھا جس میں بالتخصیص "سجود" و "حرم" کا ذکر ہے مگر اپنا یہ عالم تھا کہ سجدے سے گریزاں اور حرم سے رو گرداں ہونے کے بدولت ہی اس نہج کے اشعار دل میں اور بھی گہرے اتر گئے تھے۔

دل تو چاہ رہا ہے کہ اور کچھ نہیں تو نظم کے کم از کم ایک "کین ٹو" پر تو جی بھر کے ذکر و فکر کے دفتر کھول دیئے جائیں جواب بھی اس شدت سے مرغوب ہیں جیسے پہلے تھے لیکن آپ کی بوریت ہی سے نہیں اپنے قلم کی بے لگامی سے بھی ڈرتا ہوں اس لیے سر دست بس دو ہی ایک شعر:

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا

10590

دانہ تو خرمن بھی تو باراں بھی تو حاصل بھی تو
آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
راہ تو، رہرو بھی تو، رہ بر بھی تو منزل بھی تو

اور پھر آخر میں جب وہ مصرعہ آئے

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے

تو ارادہ یہ تھا کہ آپ سے نہیں اپنی ملحد برادری سے خطاب کروں اور پوچھوں کہ دوستو، اسلامیانِ عالم کے اس ادّعا اور ایمان کو بھول جاؤ کہ ان کا دین "زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے" مجھے تو اپنی تمام آگاہی اور اپنے تمام ذوق اور عرفان سخن کی قسم کھا کے بتاؤ کہ دنیا کی شاعری میں بھلا اس پائے کے مصرعے کب کہے گئے ہیں۔

بات پوری نہیں ہو سکتی بغیر اس امر کی وضاحت کے، زور دے کر وضاحت کیے بغیر، اہلِ عناد کو جتائے بغیر، کہ مصرعہ اوّل کا حسن تو نیم رس ہی رہتا اگر وہ مصرعہ اکیلا اور تشنہ تکمیل ہی رہ جاتا، حسن نکھر کے بے مثال تو اس وقت ہوا ہے نا جب وہ دوسرے مصرعے سے گلے مل گیا:

بے خبر تو جوہر آئینہ لیام ہے
تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

طویل نظموں سے متعلق یہ تحریر آپ کو یقیناً گراں گزر رہی ہو گی کہ یہ اصل مبحث سے بالکل بے تعلق معلوم ہوتی ہے۔ چلیئے، بے تعلق ہی سہی، لیکن بعض اوقات بے تعلق یا دور کی باتیں افہام و تفہیم میں سامنے کی باتوں سے زیادہ مفید ثابت ہو جاتی ہیں۔

تو حضورِ والا ہر ایک نظم اور اس کا ہر ایک جزو الگ الگ اپنی خاص شرح و

تفسیر کی ترغیب دینے والا تھا۔

اور ہے

خوردِ باکمال

طول کلام سے کچھ اور ناگواری گوارا کر لیجئے میری گزارش پے تو عرض کروں کہ طویل نظموں کو ذکر آگیا ہے تو "ساقی نامہ" کو بھول جانا بہت بڑا ظلم ہے۔ اس کا خاص طور سے نام لینا اس لیے بھی ضروری ہے کہ بہ خلاف دیگر بندشوں کے، یہ نظم چھوٹی بحر میں رقم کی گئی ہے۔ اور اگرچہ چھوٹی بحر میں اردو کی ساری شاعری ہی اپنے ایجاز و اجمال کے کمال پر پہنچ گئی ہے، پر 'ساقی نامہ' کو اس پورے دفتر اور خود اقبال کی شاعری میں بھی ایک بے مثال حیثیت حاصل ہے۔

شعر و سخن کی طرف توجہ ہو تو عادت ڈالنی چاہیے کہ انسان اس کی موسیقی کی طرف بھی دھیان دے کیوں کہ اعلیٰ کلام اکثر کئی کئی رنگ اور کئی کئی سطح کی موسیقی کے تانے بانے سے وضع کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ شعر ہے ہی ایک مرکب حرف وصوت کا۔ الفاظ کے آگے، بندشوں کی تہ میں، ترکیبوں، مصرعوں، شعروں کی درمیانی خلاؤں میں، شعر کی ساری ساخت میں شعر کے اوپری معنی کے علاوہ، جو درجے میں مولوی صاحب چھلکا چھلکا اتار کے تمام ضایع بدایع اور۔ تشبیہ و تلمیح کی تفسیر و تکمیل کے ساتھ کھول کھول کر سمجھا دیتے ہیں ایک وجدانی معانی بھی ہوتے ہیں جو شعر کو گھاس کاٹنے کے انداز میں پڑھئے تو سمجھ میں نہیں آتے۔

اگر قاری کا اندرونی کان بالکل بے سُرا نہیں ہے تو مصرعے یا شعر کو دو تین بار ترنم سے نہ سہی، لحن سے نہ سہی من ہی من میں گنگنا کے نہ سہی مگر ایک خفیف سی زیرِ لب نغمگی کے ساتھ پڑھئے تو یہ وجدانی معانی و مطالب اور اور بھی بعید سے بعید تر مضمرات ایک کے بعد ایک اور اکثر تو بہت سے ایک ساتھ کھلنے لگتے ہیں۔

اب اپنی ناشکیبائی کو کیا کہوں جب دیکھتا ہوں کہ ہماری جدید تنقید اس صیغے میں تقریباً صفر ہی کی سطح پر جمی ہوئی ہے حالانکہ موسیقی سے تو ہماری قوم کے مزاج کی ترکیب ہوئی ہے، بعض اوقات تو یہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ وہی اس کی پیاسی روح کا شُرب اعظم ہے۔ الہ آباد میں جب ہمارے محلے کے کھٹک برادری کے لوگ سور کاٹ کے تقریب و طعام کا سر انجام کرتے تھے اور شراب کے بجائے تاڑی کے سفالی جام گردش میں آتے تھے تو لہک لہک کے وہ کہا کرتے تھے: "پی بے پی (گالی)، پانی ہے (لمبی غلیظ گالی)..... پانی سے تو جند گانی ہے۔" گاتے نہیں تھے مگر جھوم جھوم کے اپنی اس قبیل کی گھر دری قافیہ بندی اپنے مخصوص لحن کے ساتھ ادا کر کے اپنی سرشاری کا پورا لطف اٹھایا کرتے تھے۔

گلودوز

اور اقبال کے یہاں تو لحن و ترنم کا شعبہ بالخصوص مرکزی اہمیت کا حامل ہے۔ سر عبدالقادر، ان کے پہلے تبصرہ نگار، بانگ درا کے دیباچے میں لکھتے ہیں: "طبیعت زوروں پر تھی شعر کہنے کی طرف جس وقت مائل ہوتے تو غضب کی آمد ہوتی تھی۔ ایک ایک نشست میں بے شمار شعر ہو جاتے تھے۔ ان کے دوست اور بعض طالب علم جو پاس ہوتے پنسل کاغذ لے کر لکھتے جاتے اور وہ اپنی دھن میں کہتے جاتے۔ میں نے اس زمانے میں انھیں کبھی کاغذ قلم لے کر فکر سخن کرتے نہیں دیکھا..... ایک خاص کیفیت رقت کی عموماً ان پر طاری ہوتی تھی۔ اپنے اشعار سریلی آواز میں ترنم سے پڑھتے تھے۔ خود وجد کرتے اور دوسروں کو وجد میں لاتے تھے۔'

اور آگے دیکھئے۔

"اوّل اوّل جو نظمیں جلسۂ عام میں پڑھی جاتی تھیں تحت اللفظ پڑھی جاتی تھیں اور اس طرز میں بھی ایک لطف تھا۔"

تحت اللفظ موسیقی کی ضد نہیں کیوں کہ وہ کوئی مقفی نثر نہیں ہوتی بلکہ اس میں بھی ایک وزن ایک آہنگ ہوتا ہے اور بس یہی آہنگ ہے وہ موسیقی، یعنی باطنی موسیقی جو یہاں ہماری اصل مراد ہے، یعنی آہنگ کے روپ میں ایک داخلی ترنم۔

آگے سر عبدالقادر لکھتے ہیں: "مگر بعض دوستوں نے ایک مرتبہ جلسۂ عام میں شیخ محمد اقبال سے بہ اصرار کہا کہ وہ نظم ترنم سے پڑھیں۔ ان کی آواز قدرتاً بلند اور خوش آیند ہے۔ طرز ترنم سے بھی خاصے واقف ہیں۔ ایسا سماں بندھا کہ سکوت کا عالم چھا گیا اور لوگ جھومنے لگے۔ اس کے دو نتیجے ہوئے۔ ایک تو یہ کہ ان کے لیے تحت اللفظ پڑھنا مشکل ہو گیا۔ جب کبھی پڑھیں تو لوگ اصرار کرنے لگے کہ لے سے پڑھا جائے۔ اور دوسرا یہ کہ پہلے تو خواص میں ان کے کلام کے قدرداں تھے اور اس کو سمجھ سکتے تھے۔ اس کشش کے سبب عوام بھی کھینچ آئے۔"

اب اور کیسے تصدیق ہو گی حضور میری عرض داشت کی؟

دیکھیے دونوں باتیں اہم ہیں۔

سر عبدالقادر تو صرف ایک اشارہ کر کے آگے بڑھ گئے کہ "اقبال طرز ترنم سے بھی خاصے واقف ہیں" لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقبال کو ہندوستانی موسیقی سے ایک دلی لگاؤ تھا، راگ راگنیوں سے بہ خوبی واقفیت تھی، بلکہ وہ خود بھی ریاض کرتے تھے جس کے متعلق بعض لطیفے اب تک مشہور ہیں۔ میرے کانوں تک جو پہنچا ہے اس قدر سوقیانہ ہے کہ ثقہ برادری گوارا نہیں کر سکتی کہ میں اسے دہراؤں۔

بہر حال اقبال شناسی کے ذیل میں ہمارے اوپر ایک قرض یہ باقی ہے کہ متعین کریں کہ موسیقی سے دلچسپی یا مہارت نے اقبال کے آہنگِ باطن کو کس طرح اپنے سانچے میں ڈھالا اور ان کی پوری شاعری پر کس کس جہت میں اپنی مہر لگائی۔

ساقی نامہ پر موسیقی کے شوق کی اثر اندازی ایک خصوصی حیثیت رکھتی ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔

دوسرے، سر عبدالقادر کے اس جملے پر بھی اچھی طرح غور کیجیے: "پہلے (یعنی جب تحت اللفظ میں پڑھتے تھے) تو خواص ہی ان کے کلام کے قدرداں تھے اور اس کو سمجھ سکتے تھے۔ (ترنم میں شعر خوانی کی) اس کشش کے سبب عوام بھی کھینچ آئے۔

سر عبدالقادر کی مراد غالباً یہ ہے کہ عوام ترنم کی کشش سے کھینچ تو آئے لیکن کلام کو سمجھتے نہیں تھے کیوں کہ یہ خوبی تو ان کے خیال میں خواص ہی کے لیے مخصوص ہوتی ہے کہ وہ قدرداں بھی ہوتے ہیں اور صاحبان فہم بھی۔

اک ساحر وجدانی

مجھے سر عبدالقادر کی تکذیب یا تنقیص مقصود نہیں بلکہ جزوی طور سے ان کی تائید ہی کرنی ہے کہ جب ترنم سے شعر پڑھا گیا تو عوام بھی کھینچ آئے۔ ہو سکتا ہے جو معانی و مطالب خواص پہلے سمجھے تھے وہ عوام ترنم سے شعر سن کے پھر بھی نہ سمجھے ہوں مگر ہمارے لیے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ عوام صرف ترنم ہی پر نہیں جھوم اٹھے بلکہ ترنم کی بدولت شعر کے وجدانی معانی ان کی سمجھ میں آگئے اور ان پر وجد کا عالم طاری ہو گیا۔

اور ایک بات چپکے سے اور بتادوں۔ خواص بھی یہ معنی پہلے نہیں سمجھے تھے۔ کم از کم اس گہرائی کے ساتھ نہیں سمجھے تھے جیسے اب جاکر سمجھے، زیادہ تر بے شک ترنم کی وجہ سے، مگر کچھ عوام کے جھومنے کی وجہ سے بھی۔

اور ایک کلیہ اور بھی سمجھتے چلیے۔ کوئی خاص فرق نہیں ہوتا خواص اور عوام میں وجدان کے معاملے میں، بلکہ ہو سکتا ہے کسی کسی موقع پر عوام کا درک، ان کی

گرفت، ان کی رسائی اور سب سے زیادہ انکی پختگی زیادہ بہتر ہو۔

مگر یہ وہم قطعاً نہیں ہونا چاہیے کہ وجدان لحن ہی لحن ہے۔ وجدان تو پھیلا ہوا کشف ورمز کا ایک وسیع تر عالم ہے مگر ہاں لحن اس کی کنجی اکثر بن جاتا ہے۔

ممکن ہے میرا خیال غلط ہو اور میرا تجربہ بالکل ذاتی ہو مگر معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ساقی نامہ ایسی نظم ہے جس میں فوقی اور زیریں نغمگی ایک ہی سطح پر آگئی ہے۔ ایک گونج سی ہے گہری داخلی جو نظم کے بالائی رم وخم سے یعنی اس کے چشمے ایسی ہموار روانی کے دھیمے دھیمے آہنگ سے ہم گلو ہو گئی ہے۔ چھوٹی بحر نے اس دلکی کو اور زیادہ ہلکا روان وجنباں، بلکہ ذرا اور سختی سے پرکھیئے تو نثر انداز بنادیا ہے کہ جب آپ پڑھتے ہیں

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

تو اس کا آہنگ گرانی اور رکاوٹ سے اس قدر پاک ہے کہ نثر و نظم میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اب ایک بات راز کی صرف صاحبانِ کشف ودید ہی کے لیے:

شعر اناڑی پڑھتا ہے، وہ جسے میں نے گھاس کاٹنے سے تعبیر کیا ہے، تو وہ اس کی ترتیل کو بگاڑ کر نثر سے بدتر بنادیتا ہے۔

یعنی نثر کے طرز سے شعری آہنگ کا زوال ضرور بن جاتا ہے مگر

اس کا نقطہ کمال بھی نثر نما تال ہی اختیار کر لیتا ہے

ساقی نامہ کا یہی ایک شعر نہیں بیشتر اشعار سے اس راز کی تصدیق ہو جاتی ہے۔

اور اب مضامین لے لیجئے جو اس نظم میں سموئے گئے ہیں..... یہی شعر دیکھئے جو ابھی پیش ہوا۔ کیا کائیات گیر بے کرانیاں ہیں جو بس دو مصرعوں میں مرکوز کر دی گئیں ہیں اور دو بھی کیوں، ایک ہی کہیے کیوں کہ دوسرا مصرعہ "نہ حد اس کے پیچھے نہ

حد سامنے" تو محض اضافہ ہے پہلے مصرعے پر، صرف تفسیر و تکمیل ہے اس کی۔ اور ذرا اجمال بھی ملاحظہ ہو۔ اسے آپ صرف ایجاز کہہ کر انصاف نہیں کر سکتے۔ ایجاز نہیں، اعجاز ہے یہ تو، اقبال کے معجز رقم کلام میں بھی ایک نمایاں اعجاز۔

اردو کی چھوٹی بحر کا ابھی کسی نے شاید ٹھہر ٹھہر کے تامل کے ساتھ جائزہ ہی نہیں لیا کہ کیا کیا قیامتیں ہیں جو اس کی آہستہ کلامی میں سُلائی گئی ہیں اور کیا تراش رکھی گئی ہے اس میں برش تیغ کی ایسی۔ مگر جب ہم غالب یا مومن وغیرہ کی چھوٹی بحر پے پہنچتے ہیں۔

آگے آتی تھی حال دل پے ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہ نما کرے کوئی

جان دی، دی ہوئی اس کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میر ان نیم باز آنکھوں میں　　ساری مستی شراب کی سی ہے

وغیرہ وغیرہ (جو بلا کسی غور و انتخاب کے بس یوں ہی بے تکلف یاد آگئے) تو اس میں جو جو کمالات ہیں ان کا ہمارے نقد و تبصرے نے بہت کچھ حصار کر لیا ہے۔ لیکن ان نوع بہ نوع خوبیوں کیعلاوہ اس بحر کے اشعار میں کچھ ایسی وسعت اور ہمہ گیری بھی ہے کہ ایک ایک شعر اور بعض اوقات تو ایک ایک مصرعہ مختلف اور متضاد موقعوں پہ ضرب المثل کے طور پر نیم خواندہ گفتگو میں بھی بلاغت کی ایسی بہار دکھاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے گویا موجودہ تکلم کے مفہوم کو شاعر کے مقابلے میں زیادہ خوبی کے ساتھ بیان ہی نہیں کیا زیادہ گہرائی سے سمجھا بھی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شعر مختصر کا یہ دفتر بے پایاں وہ ہے جو سچ مچ مستغنی ہے ہر

طرح کی داد سے۔

لیکن یہ ہمہ رنگ اور ہمہ عصر خوبیاں ایک طرف اور اقبال کا صرف یہ ایک مصرعہ ایک طرف

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے

جی نہیں، مبالغہ نہیں کر رہا ہوں، ایک مثالِ واحد سے قواعدِ تنقید وضع کر رہا ہوں

اقبال کے یہاں قاموسی افکار و حقائق محض ایک مصرعے میں سر بہ مہر کر دینا کوئی اتفاقی اور اتائی بات نہیں ہے۔

لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

دروں بینی پیش گوئی

مصرعہ نہیں ہے، تصدیق ہے، ثبوت محکم کے ساتھ ڈاکٹر عبدالحمید الرحمٰن ہونے کی جو قلب ایٹم شگاف ہونے کے اولین اذکار سے بیس پچیس سال پہلے تصنیف کیا گیا۔ ایٹم کو چیر کر، جو مصرعے میں رقم ہونے والے "ذرے" کا کروڑواں نہیں بلکہ اس سے بھی کئی کئی لاکھ گنا چھوٹا جزو ہے، ایٹم بم کا خورشید کو چک تو اگست ۱۹۴۵ء میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر قیامت فگن ہوا تھا مگر "ذرے" کے شق اور ریخت کے معجزہائے بے کنار کے کتنے خورشیدِ کلاں اقبال نے اس ایک مصرعے میں مضطرب اور برق پا کر دیئے ہیں! مصرعہ نہیں ہے الہام ہے گویا کسی صاحب کرامات کا جو غیر شعوری طور پر خبر دے رہا ہے سائنس کے انقلاب رواں اور بے پایاں کی، اور اس کے مستقبل کی، ایسا انقلاب جس کا سلسلہ ابھی شاید شروع ہی ہوا ہے اور نہ جانے کب تک چلتا رہے۔

اور پھر اصرار ہے میرا کہ یہ مثال کوئی استثنا نہیں۔ اس کے مماثل مفردات

وابیات اقبال کے یہاں بکثرت تو نہیں لیکن جا بجا برابر ملتے رہتے ہیں۔ لیکن جب زمان و مکان کو محصور کر لینے والی کائنات پیما تابندگی کی منزل آجاتی ہے تو چھوٹی بحر سونے پے سہاگہ بن کر ہی چمکتی ہے، دور سے چمکتی ہے، دور دور تک چمکتی ہے۔

اور ہاں، اب بھی اگر ایسے مفرد مصرعوں یا ابیات کے اتفاقی و اتائی ہونے کا کچھ گمان باقی ہو تو لیجیئے اس سے بھی وزنی اور بے امان شعر دیکھئے اسی ساقی نامے کا شعر:

پسند اس کو تکرار کی خو نہیں کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں

اہل الحاد کی تمام بحث، صدیوں اور قرنوں پر پھیلی ہوئی ساکت ہو جاتی ہے ان دو بے تکلف اور بے باک مصرعوں کی مہر سے۔ اور یہاں بھی دوسرا مصرعہ محض تفسیر ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اصل بات تو پہلے ہی مصرعے میں پوری ہو گئی۔

نومبر ۱۹۴۸ء میں پارٹی کے کام سے میں کراچی پہنچا تو پیر الٰہی بخش کالونی میں مقیم تھا۔ ایک کوارٹر میں اپنی یونیورسٹی کے الیاس احمد صاحب کو بیٹھے دیکھا۔ نہایت خنجر بے نیام قسم کے مسلم لیگی تھے اور چونکہ سیاسیات کے شعبے میں ریڈر کے عہدے پر فائز تھے اس لیے کلاس میں جب سیاست حاضرہ کا ذکر آتا تو کانگریس اور گاندھی جی کو سخت سست کہنے اور لیگ کی تعریف کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتے جبکہ لیگ کا نام بھی بیشتر طلبا کے لیے نفرت اور بدبو اور گالی کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن استاد اتنے اعلیٰ پائے کے تھے کہ انکی تمام بے باکیوں کے باوجود کسی کٹر سے کٹر کانگریسی یا مہاسبھائی طالب علم کو بھی ان کی شان میں گستاخی کرنے کی نوبت نہیں آئی اگرچہ استادوں کے لیے روایتی احترام اس وقت بھی اس حد تک ختم ہو چکا تھا کہ اقتصادیات ایسے کلیدی مضمون کے اعلیٰ پروفیسر کا روال صاحب کا اکثر کلاس میں آتے ہی اس گرم جوشی سے خیر مقدم ہوتا تھا کہ دیوار کے بلیک بورڈ پے موم پھلیوں کی چاندماری ہونے لگتی تھی۔

ہندو قوم پرستوں سے کہیں زیادہ میں خود الیاس صاحب کی سیاست کا شدید اور بے دریغ مخالف تھا اور ہوں مگر انھیں دیکھا تو سلام کرنے حاضر ہو گیا۔ الیاس صاحب تمہید اور پیش بندی وغیرہ کے بالکل قائل نہیں تھے۔ بولے: تم نے کیمونسٹ فلسفے کی کون سی کتاب پڑھی ہے۔ عرض کیا لنین کی مادیت اور تجربی تنقیدیت۔

پوچھا اس میں تمھیں کہیں خدا تو نظر نہیں آیا نا؟ جی نہیں ایسا تو نہیں ہے، ایک جھلکی سی ضرور ملی، میں نے گزارش کی، جہاں مادّے کے "داخلی تموّل" کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ فقرہ اس کتاب میں نظر سے گزرا یا فلسفۂ مادیت کی حمایتی کسی اور تصنیف میں۔

فرمایا تم نے جھلکی ہی دیکھی بس؟ لاؤ میں پورا مشاہدہ کرادوں۔ دیکھو پوری شہادت تو تمھارے ہاتھ کی ہتھیلی میں موجود ہے۔ پھر انھوں نے ہاتھ کی انگلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اصرار کیا کہ اس نمونے کے نشان کو نہ تو پہلے کبھی دہرایا گیا اور نہ آئندہ کبھی دہرایا جائے گا۔

اس وقت اس مضمون کو پھیلانے کی گنجایش نہیں لیکن اس کے بعد الوہی وجود اور اس کی وحدانیت کے بارے میں کبھی شبہ نہیں ہوا۔

لیکن ان مثالوں کو آپ کہہ لیجئے کہ یہ تو دین کے الٰہیات اور کائنات کے مضامین ہیں، مگر مبادا آپ کو یہ گمان ہو کہ اگرچہ یہ اقبال کا محبوب گوشہ ہے اور اس میں تو وہ نوادرات کے موتیوں کا انبار لگاتے ہی رہتے ہیں، اکثر و بیشتر ہی نہیں بلکہ متواتر

تو میں عرض کروں گا جی ہاں، بے شک لگاتے ہیں وہ ایسے نادر موتیوں کے انبار لیکن آپ کی یہ تعریف معکوس تنقیص نہیں ہونی چاہیے۔ الوہی امور سے بہت دور جب وہ اس دنیا اور اس کی قوموں اور ان کے طور طریقوں پر طبع آزمائی کرتے ہیں

تو وہاں بھی ان کے قلم سے اسی پائے اور اسی تکمیل و تدبیر کے شعر نکلتے ہیں۔ دیکھئے دو مصرعوں میں ایشیا کی سیاسی بیداری اور شہنشاہیت کے خلاف صف آرا ہونے کی تاریخ کو کس طرح چٹکی بجاتے ہوئے استعارہ بند کر دیا ہے:

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے ہمالا کے چشمے ابلنے لگے

چینی گراں خواب محض ان معنوں میں نہیں تھے جن میں ایشیا کی اور قومیں بھی مبتلا تھیں یعنی اس امر سے بے خبر کہ مغربی استعمار بالخصوص یوروپی سامراج کے پنجوں کی گرفت میں وہ کیسے خوفناک عذاب میں پھنسے ہوئے ہیں بلکہ چینیوں کی خوابیدگی اس وجہ سے اور زیادہ گراں تھی کہ پوری قوم افیون نوشی کی لعنت میں بھی مبتلا تھی۔

اس طرح نظم کا دھارا ایک ایک مرحلے سے قیام کئے بغیر گویا رواروی میں گزر جاتا ہے اور جہاں پل دو پل رکتا ہے وہاں اس کے حسن کی شان کچھ اور ہی ہو جاتی ہے۔

پہاڑی ندی محو خرام ہے، آہستہ خرام نہیں بلکہ شوریدہ خرام، مگر اسی کے ساتھ مصرعوں کا آہنگ خود بھی اس میں ایک اور زود خرامی کا زیر و بم پیدا کر رہا ہے:

وہ جوئے کہستاں اچکتی ہوئی اٹکتی لچکتی، سرکتی ہوئی
اچھلتی، پھسلتی، سنبھلتی ہوئی بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

یہ تو بہت ہو گیا۔ اتنا کب ٹھہرتے ہیں اقبال کم سے کم اس نظم میں، جی ہاں، چار چار مصرعے دو نہ تین۔ کہاں یہ پورے چار اور کہاں وہ رفتار کہ بس آدھے مصرعے میں مشرق سے مغرب تک پہنچ گئے ہیں، اکثر مکان و زمان کے ابعاد پورے کر لئے ہیں۔

مگر اس ٹھہراؤ کو حسن تام کا درجہ دینا مقصود تھا شاعر کو، کیوں کہ اس کے

بغیر وہ گہرائی اور وہ ضربِ کاری کا زور آ ہی نہیں سکتا تھا جو ان اشعار کے مجموعے کو کلیے اور حدیث کی منزل پے پہنچا دیتا ہے۔

رکے جب تو سل چیر دیتی ہے یہ پہاڑوں کا دل چیر دیتی ہے یہ

ان چار مصرعوں کے بغیر پانچویں مصرعے کے لفظ "رکے" میں وہ فطری موزونیت کہاں سے آتی جو اب اشعار کے اس زمرے کا طرۂ امتیاز ہے۔

اب مشکل یہ ہے کہ جستہ جستہ اشعار ہی لینے کے باوجود طول بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس سلسلے کو یہیں ختم کر دیا جائے اور ان محاسن تک کا ذکر نہ کیا جائے جو نظم میں من حیث المجموعی موجود ہیں۔ البتہ ہم محض ایک چھچلتی نظر سے ان سوالات کو چھوتے ہوئے گزر جائیں گے کہ، بر خلاف اقبال کی دوسری نظموں کے، جو طویل سے طویل ہونے کے باوجود اپنی جگہ بندھی ہوئی ایک متصل پیکٹ کی شکل رکھتی ہیں، ساقی نامہ میں جو ایک آزادہ روی اور 'نا محکمی' سی ہے اس کی کیا نوعیت اور اہمیت ہے اور کس طرح خود یہ بکھراؤ اور ظاہری انتشار یا پراگندگی کی قسم کی تمام مذموم خصوصیات یہاں آکر خوبی اور صفت کا انداز اختیار کر لیتی ہیں، یعنی اقبال نے یہاں اپنے قلم کی آزاد خرامی سے کیا کیا کام لیئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

تو گویا طویل نظموں میں یہ احساس ہوتا ہے، اور دوسری نظموں میں بھی یہی احساس ہو تو ساقی نامہ میں ابھر کے واضح اور شعوری بن جاتا ہے، کہ ایک فطری چشمہ ہے جو کسی کوشش اور جد و جہد سے نہیں، بند باندھنے اور راستے مقرر کرنے کی خارجی مداخلتوں کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ گویا خود بخود ابلتا چلا آ رہا ہے اور بہتا جا رہا ہے کسی کے مقرر کیئے ہوئے نہیں بلکہ خود اپنے آزاد راستے پر۔ یہ احساس بھی مجھ کو معلوم ہوتا ہے کہ ایک امتیازی نشانی ہے، حد فاصل ہے، طویل نظموں اور اذان یا جبریل و

ابلیس ایسی مختصر نظموں کے درمیان جن میں کپڑے پر بیل بوٹے کاڑھنے کے انداز کی زردوزی کی سی کیفیت ہے کہ ایک ایک ٹانکا محنت و جاں فشانی ہی سے نہیں فکر و انتخاب و احتیاط سے روبہ تکمیل ہوا ہے۔

چنانچہ 'اذان' میں بھی جب ہم اس مرحلے پر پہنچتے ہیں جہاں چاند کا خطبہ شروع ہوتا ہے تو اس مقام پر یہی متناسب گلکاری نمایاں ہے، نمایاں کیا ہے گویا ہے، اور اپنی گویائی سے ہماری پسندیدگی کو جلا بخش رہی ہے۔ "حقیقت حسن" نامی نظم میں، جو اگرچہ بانگ درا کی بھی ابتدائی نظموں ہی میں شامل ہے، "اذان" کے مکالمہ فلک کے ساتھ کچھ متوازیات کا سلسلہ موجود ہے۔ مثلاً "فلک پے عام ہوئی، اختر سحر نے سنی" "سحر نے تارے سے سن کر....." وغیرہ۔ مگر یہاں چاند کو کوئی مرکزی اور معزز جگہ دینی مقصود نہیں تھی اس لیے اس کی نشان دہی کے لیے صرف "قمر" کے نام پر اکتفا کی گئی ہے۔

کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی

ایک اور نظم "صبح کا ستارہ" میں چاند کا ذکر اور بھی روا روی سے آیا ہے

لطفِ ہمسائیگی شمس و قمر کو چھوڑوں　　اور اس خدمت پیغام سحر کو چھوڑوں؟

مگر "اذان" میں چاند کی حیثیت بزرگ و محترم ہے، وہی تو اس بزمِ کلام کا مقرر اعظم بن کر سامنے آتا ہے اور جو کچھ وہ 'فرماتا' ہے اس کو تمام اطرافِ عرش پر بے چون و چرا تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس لیے اب وہ "قمر" نہیں رہا۔ اب اس کا اسمِ گرامی "مہِ کامل" رکھا گیا ہے اور اس کی جنبشِ نطق میں ایک الگ بالا نشینی کی شان پیدا کی گئی ہے۔ چنانچہ جتنے بھی تکلم ابھی تک آئے سب کے لیے "کہا" یا "کہنے لگا" کا فعل ہے مگر چاند کے لیے وہ عام لفظ نہیں آیا جو بار بار کے استعمال سے گھس گیا تھا اور سب کے

لیے جائز تھا، بلکہ مصرعہ شروع ہوتا ہے "بولا" کے لفظ سے۔ "بولا مہ کامل" اور غالباً یہ میری محض خوش فہمی نہیں کہ "بولا" کے ذریعہ "کہا" پر ایک خفی سی فوقیت بھی جتانی شاعر کو ملحوظ ہے۔ اس لیے کہا:

بولا مہِ کامل کہ وہ کوکب ہے زمینی

مگر بات یہاں ختم نہیں ہوتی

اس مصرعے کو ذرا اور باریکی سے دیکھنے کی ضرورت ہے۔

جہاں "مہ کامل" کے نام سے چاند کی مقتدر حیثیت مدِ نظر ہے وہیں اس مصرعے میں چاند کی معکوس حیثیت بھی ملفوف کر دی گئی ہے۔

"مہ کامل" کے آگے اس کے لیے ثناو صفت کا کوئی اہتمام نہیں۔

کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ ممدوح تھوڑی ہے۔ ممدوح تو انسان ہے "کوکب زمینی۔" چاند کا خطبہ تمام کا تمام اسی کوکب کی تعریف و توصیف کے لیے وقف ہوگا، وہ خود اگر نسبتاً خوردنہ دکھائی دیتا تو بزرگی کا کس جواز سے رطب اللسان ہوتا؟

یہ تو ہوئی مہِ کامل کی بات جو نظم کے وسط کی منزل ہے۔ اب ذرا واپس بھی ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ یہاں تک پہنچنے میں جتنے بھی بیل بوٹے کاڑھے گئے ہیں ان میں سے ہر ایک کیسا مطبوع و مناسب ہے۔

ایک رات ستاروں سے کہا نجم سحر نے

محفل چیدہ

کیا اندازہ ہوتا ہے اس مصرعے سے آسمان کی جغرافیہ کا؟ نجم سحر کی ترکیب صرف نام ہی کی نشاندہی نہیں کرتی کہ فلاں فلاں تارے نے کچھ کہا بلکہ وقت کی بھی تخصیص کر دیتی ہے۔ چنانچہ اب اس تارے کی نمودِ نمایاں کا جو وقت آیا تو کیا ستارے تمام و ہمام بکھرے ہوئے ہیں ریگِ صحرا کی طرح چرخِ تاریک کی وسعت نا ابعاد میں؟

جی نہیں، روشنی کی تباشیر پھیلنی شروع ہو گئی ہے اور بس نام و نمود والے خاص خاص اراکینِ فلک باقی رہ گئے ہیں نظم کی بزم دید و دانست میں۔ تو اب یہ نہ کہئے گا کہ سوال تو سارے ہی ستاروں سے کیا گیا تھا، جواب دینے والے دو ہی کیوں رکھے گئے؟ دو ہی سے جمع کا صیغہ ظاہر ہو جاتا ہے اور جواب دینے والوں کی شناخت کیجئے تو ان کی شخصیت کافی ہے تمام باشندگانِ چرخ کی نمائندگی کے لیے۔ یعنی کہنے کے لیے صرف دو ستارے جواب دیتے ہیں مگر اصل میں پوری محفل سیارگاں ہے جو اس وقت ہم کلام ہے۔ موجود کچھ اور ستارے بھی ہوں گے، مگر ذکر کے قابل نہیں۔

اچھا نجمِ سحر کو سوجھی کیا انسان کے متعلق یہ بحث چھیڑنے کی؟

جی ہاں، سوچئے، کیا سوجھی تھی؟

یاد کیجئے، میں نے کہا تھا کہ "حقیقتِ حسن" والی نظم میں "اذان" کے متعدد متوازیات وارد ہو چکے ہیں۔ وہاں بھی یہی کردار ستاروں کے آسمان کو (اس نظم میں انسان کے بجائے حسن کی) زمین سے ملاتا ہے۔ "کہیں قریب تھا یہ گفتگو قمر نے سنی" کے بعد آتا ہے

فلک پے عام ہوئی اختر سحر نے سنی
سحر نے تارے سے سن کر سنائی شبنم کو
فلک کی بات بتا دی زمیں کے محرم کو

تو یہاں بھی اختر صبح ہی رابطے کی وجہ اوّل ہے زمین و آسمان کے درمیان اور کہنے کے لیے "حسن" اور "عام" ارباب فلک کے درمیان۔

زمین کے ساتھ انجم سحر کی وابستگی بلکہ ایک طرح کی شیفتگی اور زیادہ شدت سے نمایاں ہے اس نظم میں جس کا نام بھی "صبح کا ستارہ" ہے۔

لطفِ ہمسائیگی شمس و قمر کو چھوڑوں اور اس خدمت پیغام سحر کو چھوڑوں
میرے حق میں تو نہیں تاروں کی بستی اچھی اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسمان کیا، عدم آباد وطن ہے میرا صبح کا دامنِ صد چاک کفن ہے میرا

مگر شیفتگی کوئی ایسا جذبہ تو ہے نہیں جو چاند کے مانند محض ایک ہی رخ رکھتا ہو۔ اس کا تو وہی مضمون ہے جو محبت کے لیے ضرب المثل ہے کہ "دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی" اگر ستارۂ صبح زمین کی پستی کا شیدائی ہے تو قلبِ گیتی میں بھی ذوق و شوق کا وہی عالم ہے۔ اقبال اسی مادرِ گیتی کے تو فرزند ہیں جو "صبح کا ستارہ" میں ہم ان کی آواز سنتے ہیں اور ایک دلی تمنا کا ساتھ ستارے کو دعوت دیتے ہوئے پاتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کی خوش آمدید کے لیے انھوں نے اپنا آغوش سخن کیسی کشادگی سے وا کر دیا ہے

ایک عجیب افسردگی ہے ستارے کو اپنی مدت حیات کے مختصر ہونے پر جو وہ کہتا ہے:

بساط کیا ہے بھلا صبح کے ستارے کی نفس حباب کا تابندگی شرارے کی

مگر اقبال تو شاعر ہیں، ان کے پاس ستارے کے مرضِ مجبوری کا علاجِ وہاج موجود ہے کیوں کہ شاعر تو وہ جادوگر ہے جو بجلیوں کو بھی پایندگی بخش دے۔ چنانچہ ستارے کو بلاتے ہیں اور اطمینان بھی دلاتے ہیں:

کہا یہ میں نے کہ اے زیورِ جبین سحر غمِ فنا ہے تجھے گنبد فلک سے اتر
ٹپک بلندیٔ گردوں سے ہمرہ شبنم مرے ریاضِ سخن کی فضا ہے جاں پرور
میں باغباں ہوں، محبت بہار ہے اس کی بنا، مثالِ ابد، پائیدار ہے اس کی

اور اقبال کے یہاں یہ کوئی وقتی لگاؤ نہیں، یا محض ایک خیال گزراں جو نظم کی

خوبصورتی کے لیے ذہن نے تخلیق کر لیا ہو۔ بلک حقیقت یہ ہے کہ نجم سحر تو وہ ہے کہ انھوں نے سچ مچ اس کے لیے اپنا دامن شعر بڑی وسعت کے ساتھ پھیلا رکھا ہے کتنی نظمیں ہیں، کتنے مواقع ہیں جن میں اس کی طلعتِ معتدل کی ضیا موجود ہے، خود اس تحریر پر بھی مسلسل اس کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ اس ایک نقطہ کشش سے اقبال کو کتنی وابستگی ہے اور اپنی مسند سخن میں اس ایک ہستی کے لیے کیسے وقیع مقام پر اس کی نشست کا اہتمام کیا ہے اس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ یہی ایک مضمون ہے جس پر الگ سے ایک نہیں دو دو نظمیں موجود ہیں اور وہ بھی آس پاس رقم کی گئی ہیں، کسی بالواسطہ حوالے کے ساتھ نہیں بلکہ خاص اس کے نام سے ایک جگہ "صبح کا ستارہ" کے عنوان سے اور دوسری جگہ "اختر صبح" کے عنوان سے۔

تو اب جواب مل گیا اس سوال کا کہ ستارے کو آخر فکر ہی کیا پڑی تھی انسان کی جو اس نے یہ بحث چھیڑ دی؟

بحث خواہ مخواہ نہیں تھی۔ یہی صبح کا ستارہ تو ہے جو زمین کا، انسان کی آماجگاہ کا، مسلسل مشاہد اور نگراں رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اسے زمین کے مکینِ خاص کے بارے میں ایک فطری تجسس ہے، محض معروضی اور بے نیاز تجسس نہیں، بلکہ ایسا تجسس جس میں ایک لگاؤ، ایک خیر اندیشی کا عنصر بھی شامل ہے، چنانچہ اس کے اور ساتھیوں نے تو انسان کی کھلے بندوں اور بے محابا مخالفت کی لیکن اس کا لہجہ ہر طرح کے بغض و عناد سے قطعاً بے لوث ہے، وہ کہتا ہے تو صرف اس قدر کہ

آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار

آسمان کے اور بڑے بڑے کھیا جو انسان سے عداوت رکھتے ہیں ان کی دشمنی ان کے ایک ایک لفظ سے جھلک رہی ہے۔ ان سے گفتگو میں نجم سحر انسان کے ساتھ

اپنے تعلقِ خاطر کو اس شماتت زدہ مجلس میں برملا ظاہر کرے تو یہ خود اس کے وقار کے منافی ہے۔ اس لیے وہ اپنے تجسس کو صرف ایک بہ ظاہر بے تعلق سوال کی شکل دے دینے پر اکتفا کرتا ہے۔ شاید اس نے رنگِ محفل دیکھ کر دانستہ اپنے سوال کا اسلوب ایسا رکھا ہے گویا اس میں انسان کے لیے کسی قدر ذم و تشنیع کا ہی پہلو مضمر ہے اور گمان ہوتا ہے کہ وہ در پردہ انسان کی خوابیدگی اور اس کی عیش کوشی کی جانب اشارہ کر رہا ہے اور کوئی دل کا بہت کھوٹا ہو تو یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ سوال کے سائے میں دراصل وہ طعن مار رہا ہے۔

اب اگر آدم بیداری سے سراسر بیگانہ ہوا تو بلاشبہ یہ سوال اس کی تنقیص ہی سمجھی جائے گی۔

لیکن غور و تامل سے کام لیجئے تو یہ مصرعہ "آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار" اس کی تنقیص کی تمہید نہیں بلکہ ستارے کی بلاغت کا انداز ہے۔ آدم کے لیے یہ جو بے تعلقی کا دکھاوا ہے اس کی بدولت وہ مجمع کے اندر انسان دشمنی کا جو جذبہ جاری و ساری ہے اس سے اپنے ایک رخ میں بہ خوبی ہم آہنگ بھی ہے جس سے مخالفین کو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ہاں ہماری طرح یہ بھی انسان کا دوست نہیں اور سوال کی شکل میں دراصل اس کی بدبختی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

حرف تمنا

لیکن ہم لوگ، نظم کے قاری، چونکہ ان ساکنانِ فلک کی دشمنی سے پاک ہیں اس لیے ہم کو یہ دھوکا نہیں ہوتا کہ اختر صبح کا سوال تو ایک کمیں گاہ ہے آدم پر حملہ کرنے کے لیے یا بیداری سے اس کی محرومی کو اجاگر کرنے کے لیے' بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ستارے کے ضمیر میں آدم کے یعنی ہمارے لیے خیر سگالی کار فرما ہے اسی طرح عرش بے پایاں کے تمام چھوٹے بڑے ثابت و سیار میں بس یہی ایک ستارہ ہے

جس سے ہم خاص طور سے مانوس ہیں، جس کو ہم ایسی اپنائیت کے ساتھ جانتے ہیں کہ ہمارے بچے تک اکثر اس کو پہچان لیتے ہیں اور اس وجہ سے ہم اس کے اس سوال پے پہنچتے ہیں تو ہمارا دوستدار دل گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ سوال حرف طعن و طنز نہیں سراسر حرفِ تمنا ہے۔

سُکانِ فلک کے لیے اقبال کا رویہ عام طور پر دوستانہ نہیں رہتا لیکن اختر سحر کے متعلق ان کا دل کس طرح ہر جذبہ کدورت سے پاک ہے۔ یہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں۔ اس لیے اقبال جب نظم کا افتتاح اختر سحر کے سوال سے کرتے ہیں تو اب ستارے کے تجسس کو ہم لازمی طور سے ایک فطری فرزانگی پر محمول کرتے ہیں، بدنیتی نہیں سمجھ سکتے۔

یہاں وہ بات نہیں کہ ہم تو تنگاترشی میں بسر کر رہے ہیں۔ اب ایک روز ہمارا بچہ خوش حال گھرانے کے پڑوس میں گیا تو بی ہمسائی کھود کھود کے پوچھ رہی ہیں: ارے بولتا کیوں نہیں لونڈے، کیا پکا ہے تیرے یہاں؟ مقصد معلومات فراہم کرنا نہیں بلکہ یہ بتانا اور محلے میں اس کا ڈھول پیٹنا ہے کہ موئے نفاختوں کو مچھلی گوشت تو کیا نصیب ہوتا ساگ بھاجی بھی میسر نہیں۔ روز کم بخت ابالی دال کھاتے ہیں کھلاتے ہیں۔

ہمارا دل بول رہا ہے کہ ستارہ سچ مچ بے تعلق ہوتا تو یہ ذکر ہی نہ چھیڑتا۔ لیکن اوّل تو وہ صاحب نظر واقع ہوا ہے، جو کچھ پیش آتا ہے اور آسکتا ہے اس کے متعلق بے اعتنا نہیں بلکہ بیدار و آگاہ ہے۔ دوسرے زمین پر زندگی کی اوّلین جنبشیں خرام آشنا ہو چلی ہیں، طیور و صغور کی ننھی ننھی بیداریاں آنکھ کھولنے لگی ہیں، تو ناممکن ہے کہ اس کے درد مند اور رتبہ شناس باطن پر اس یقین کی پرچھائیں نہ پڑی ہو کہ انسان تو امیر لارض ہے، زندگی کا اوّل، جنبشوں کا محرک، اس کے قدموں کی چاپ،

اس کے قیام و خرام کی دھمک ضرور کہیں نہ کہیں سننے میں آرہی ہو گی۔ اس لیے تجسس ہی سے نہیں، ایک شوق، ایک آرزو مندی سے پوچھتا ہے، اطلاع حاصل کرنے کے لیے کم، اپنے اعتماد کی تصدیق کے لیے زیادہ:

آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار

لیکن "کبھی" کے لفظ کو کیا کیجئے گا؟ اس نشتر کی چبھن کے لیے کہاں ہے جگہ آپ کی موجودہ تفسیر دردمندی میں؟

ارے بندہ نواز، کیوں مجبور کر رہے ہیں آپ مجھے کہی ہوئی بات کو کئی کئی رخ سے دہرانے پر؟ دیکھئے اسی لفظ کی تلخی نے تو اسے بزم پیشیں کا ہم صفیر بنایا ہے، لیکن اس سے مراد یہ نہیں کہ انسان کبھی بیدار ہی نہیں ہوتا بلکہ "کبھی" کا یہ لفظ اصل میں تو صرف بدل ہے لفظ "کہیں" کا۔

اچھا تو پھر تصدیق ہوئی کہ نہیں ہوئی انسان کی بیداری کے متعلق نجمِ سحر کے اعتماد کی؟

ابتدا سے ربط

مگر یہی تو موضوع ہے میری موجودہ تحریر کا-اور اس نظم کا بھی۔

کیا ہم یہ مان لیں کہ اقبال جیسا عظیم فن کار ایسی چھوٹی سی نظم میں بھی اختتام تک پہنچتے پہنچتے آغاز کو بالکل بھول جائے گا، انجام کا آغاز سے کوئی ربط پیدا ہی نہیں کرے گا؟

دوسرے قدم کے بعد پہلے قدم کا دھیان رکھنا بکھیڑا ہی تو ہے، اس بکھیڑے میں کوئی کیوں پڑے۔ ایک قدم، دو قدم، دس قدم - سیڑھی لگا کر چڑھ آئے تو بس اب پھینک دیں سیڑھی کو؟

یہی ہے اقبال کا آرٹ؟ یہی شہ کار ہے ان کے ہنر کا!؟

ماشاء اللہ یہی ہے وہ عظمت جس کے مقابل اہلِ بینش، ایک آدھ کو چھوڑ کر، کسی حسن کار کسی شاعر کو خاطر میں نہیں لاتے؟

شیکسپئر، کالی داس، حافظ - ان کی تعریف نہیں کی جاتی، صرف نام لے لینا کافی ہوتا ہے، اور اکثر تو اس کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ پھر بھی حضور یہ تو گزری ہوئی بہار ہے۔ کتابی عظمت، وہ بھی تاریخ کی بیساکھی پر ٹکی ہوئی زیادہ، شاعری کی قدر شناسی پر کم۔

مگر اقبال تو آفتابِ نصف النہار ہے ابھی، بھلا کس کی مجال ہے جو اس کے قدو قامت کی پیمائش کرے، اس کی بلندی کے ظن و تخمین کے لیے گردن اٹھائے، یہ تو وہ مہرِ درخشاں ہے جس کی ضیا وہاں بھی پہنچ رہی ہے جو رُخ براہ راست اس کے سامنے نہیں۔

اس لیے بالکل ہی محال تھا کہ اقبال انجام کو آغاز سے بے ربط اور آغاز کو انجام سے بے خبر رکھیں۔ نجم سحر کے اعتماد کی تصدیق ہوئی، یقیناً ہوئی، اس کے سوال کا جواب آیا، بالتحقیق آیا:

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر کرتے ہیں خطاب آخر اٹھتے ہیں حجاب آخر

اور "آخر" ہی میں آیا۔

جواب کا آوازہ زمین سے بلند ہوا تو کوہ و دمن کو رعشہ براندام کرتا ہوا اور فلک الافلاک کو چیرتا سائل تک پہنچا تو ایک نعرۂ الوہی بن کر پہنچا:

اللہ اکبر، اللہ اکبر! اللہ اکبر!

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز!

اچھا جواب والے شعر کا دوسرا مصرعہ بھی آپ کی توجہ کا منتظر ہے۔

کرتے ہیں خطابِ آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر

اپنے اصل مقام پر تو مصرعے کا غالب عنصر شعریت اور تغزل تھا کیوں کہ وہاں تو خطاب بھی استعارہ تھا حجاب کشائی بھی۔ لیکن یہاں اس نظم کے چوکھٹے میں رکھئے تو مصرعے کے دونوں جزو بڑی معنویت پیدا کر رہے ہیں، اشارے چھپے ہیں ان کے اندر، گہرائیاں دبی ہوئی ہیں دبیز۔

رسمی طور پے آپ چاہیں تو بس یہ کہہ کے نکل جائیں کہ پراگندہ خیال ستارے منتظر تھے چنانچہ ان کا انتظار رائیگاں نہیں گیا، اذان نے بالآخر ان سے خطاب کیا اور انھیں فہم و دانش و آگاہی کی دولت بخش دی۔ مگر یہاں خطاب کی نوعیت کچھ اور بھی ہے: عجب وقت تھا۔ رات بھی تھی مگر گریزاں، ماحول میں خاموشی ہی خاموشی، ماند ہوتے ہوئے ستاروں کی شمعیں خاموش، زمین و آسمان مہر بہ لب، فطرت سماسے سمک تک سناٹا ہی سناٹا۔ کہ دفعتاً سکوت کا یہ حصار خود بخود ٹوٹا! اذان کا وہ انقلاب رو نما ہوا جس نے گویا زمان و مکان کو منقلب ہی نہیں بلکہ متحرک بھی کر دیا، اذان کی گویائی میں وہ فراوانی تھی کہ صداؤں کے دریا، اور سخن کی قلزم لہرا کر جنباں ہو گئے، طیور و صغور سنکنے اور چہکنے لگے، زبان والے ہی مصروفِ کلام نہیں ہوئے بلکہ حجر و شجر، صبا و ضیا، وجود و نمود، ہر ایک اپنے اپنے سلیقے، اپنے اپنے اسلوب سے گویا اور حرف آشنا ہو گیا۔ اب تو موجوداتِ عالم کو اظہارِ اسرار کا وہ شوق، وہ سرور بے پایاں ہے کہ ذرے ذرے پر مصرعے کا یہ جزو صادق آ رہا ہے:

کرتے ہیں خطاب آخر

تو جواب آیا، مگر کس وقت آیا؟ اس وقت نہیں، اس طرح نہیں کہ

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی

پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

وہ صورت نہیں کہ "ہم تھک بھی گئے چمک چمک کے" ستاروں کی چہ می گوئیاں شانت ہو گئیں، وہ محفل ہی منتشر ہو گئی جس میں بحث مباحثے گرم تھے، وہ ہستی ہی معدوم ہو گئی جس نے سوال اٹھایا تھا

پہلے پہل

اور انتظار کیا تھا

نہیں، قطعاً نہیں، قدرت کے اہتمام کے ہم قدم نظم میں بھی جواب آیا ہی نہیں بلکہ صحیح، بالکل صحیح وقت پے آیا۔ اذان اس وقت ہوئی جب باپ نے نماز کے لیے اپنے نونہال کو جگایا اور وہ زیر آسمان وضو کرنے نکلا تو یہی نجم سحر تھا، اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ، جس نے پہلی نظر میں بچے کی پاکیزہ اور نازک روح کو بالیدگی عطا کی۔

اب جو دیکھا تو نجم سحر کے علاوہ بھی، جس کے حسنِ طلعت کو اس کی بینشِ زیبائی پہلے ہی سے بہ خوبی پہچانتی تھی، اور بھی ستارے تھے کچھ نہاں اور کچھ عیاں، اس کی طرح نیم خوابیدہ اور نیم رس۔

تو اب اس معصوم اور اس لیے صائب گواہی کی تصدیق کر کے کیوں نہ آپ بھی جذبۂ ثواب میں داخل ہو جائیں؟

اور انکار کریں اس کا کہ

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ

اور اقرار کریں کہ بحمد اللہ

آخرِ شب دید کے قابل ہے سحر کا منظر

یعنی جواب آیا تو بروقت و بر محل آیا

مگر سابق میں اقبال ہی کے حوالے سے جو عرض کیا تھا کہ جواب آیا اور "آخر ہی میں آیا" تو اِس جواب اور اُس جواب، اِس آخر اور اُس آخر میں ایک فرق بھی ہے۔

وہاں جواب "افلاک سے" آیا اور شاعر نالہ کناں کے دل میں جاگزیں ہوا، یہاں جواب کا آوازہ زمین سے بلند ہوا تو تاروں کی بزم تک پہنچا اور پھر فلک الافلاک کو شگافتہ کرتا ہوا ملاءِ اعلیٰ میں صدر نشین ہو گیا۔

وہ "آخر" اختتام تھا پیہم انتظار کا، حرماں و فکر و ناشکیبائی کا۔ اور یہ "آخر" ہے ہی نہیں بلکہ تکمیل ہے اصل میں، تضمین ہے ستاروں ہی کے مضمون پر "تنسیخ ہے، فیصلہ کن، ان کے سارے الزام، ساری عیب جوئی کی۔

یہ اختتام تو آغاز ہے دراصل، ہمہ جہت آغاز

سایۂ عقب

جس کی الوہی نوعیت میں ایک لطیف رمز بھی پنہاں ہے۔

جواب کی پاکیزگی کا سایہ پیچھے بھی پڑ رہا ہے جس نے سائل کے خلوصِ نیت کو بھی مستند کر دیا ہے۔ اب یہ شبہ کرنے کی گنجائش نہیں رہی کہ سوال میں کہیں بھی آدم کے لیے تکسیر یا استہزا کا کوئی شائبہ موجود تھا۔

نجمِ سحر نے موضوع پیش کر دیا، حاضرین اپنی اپنی رائے ظاہر کرنے لگے، مصرعہ طرح مقرر ہوا، مشاعرہ گرم ہو گیا۔

مگر کس کی کیا رائے ہے، کس نے کیا شعر نظم کیا یہ جاننے سے پہلے ایک نظر مجمع پر ڈالنا بھی ضروری ہے۔

پھر یاد دلا دوں کہ ڈرامے کے وقت کا تعین ملحوظ رکھنا ہے۔ صباحتِ سحر آہستہ آہستہ آسمان پر پھیلنے لگی ہے۔ ہزاروں لاکھوں ستارے ماند ہوتے ہوتے نظر

سے اوجھل ہو چکے ہیں۔ وسطِ شب کی گھنی آبادی کے بجائے اب صرف سر بر آوردگانِ گردوں ہی باقی رہ گئے ہیں۔ اگر لاکھوں کروڑوں میں سے ایک آدھ کو چن لیا جاتا تو جنبہ داری کا الزام آجاتا۔ بھلا بتایئے، ایک دو لاخیرے نے اگر زہر میں بجھی بولی بول بھی دی تو اس کو اس طرح کیوں پیش کیا جائے گویا آدم بیزاری سکانِ فلک کا کوئی عام اور مشترک جذبہ ہو۔ اس لئے اب یہ عذر ممکن نہیں رہا۔ اب گنے چنے احباب تکدر و تمکنت ہی بچے ہیں اور ان کی گفتگو بے شک نمائندہ ہے پوری مجلس کی۔

ابھی تک تو ہم یہ سوچتے رہے کہ مجمع تقریباً سارے کا سارا مخالف ہے۔ لیکن اب اس امر کی جانب بھی توجہ کرنی پڑے گی کہ مخالفت اندھی اور بے بنیاد نہیں ہے بلکہ دلائل و براہین سے آراستہ اور مناسب و معقول مخالفت ہے۔ ایسی ہی مخالفت وقیع ہوتی ہے، مقرر کے لیے بھی، موضوع کے لیے بھی اور سب سے زیادہ ہدف تنقید کے لیے۔

بڑے لوگ مخالفت بھی چھچھورے انداز سے نہیں کرتے۔ یہاں حزب مخالف کی تقریروں میں ذرا بھی وہ کمزوری نہیں جو ہمارے ایوانوں میں نظر آتی اور گراں گزرتی ہے کہ مقررین نے من مانی اپنے اپنے نکات طے کر لیے: رشوت ستانی پے کفِ افسوس میں ملوں گا، عوام کی خستہ حالی پے غصہ آپ کو آئے گا۔ اس تقسیمِ کار میں مقرر کی دلچسپی یا موزونیت کا، یا موقع محل کی مطابقت کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ اس طرز تقسیم میں یہ بھی ممکن تھا کہ عوام کی خیر خواہی پے آنسو میری آنکھوں کو بخشے جاتے اور رشوت کی گرم بازاری پے لعن و طعن آپ کرتے۔ مگر یہاں ہمارے ایوانِ بالا میں ژولیدہ بیانی کو قطعاً دخل نہیں۔ یہاں تو مناسبت بھی اس سے کہیں زیادہ ہے جس درجے کی حقیقی جمہوریت کی پارلیمنٹ یا کانگریس میں اختیار کی جاتی ہے کہ حزب مخالف کا ارادہ اگر اقتصادی بدحالی کو نمایاں کرنے کا ہے تو اس کی صفوں میں سے وہی

تقریر کرنے کے لیے منتخب ہوگا جو کم سے کم ایک آدھ بار وزیر مال رہ چکا ہو یا مسلمہ ماہر معاشیات ہو۔ ریلوے کی افراتفری کا ذکر کیا جائے گا تو یہ ذمہ داری خاص اسی شعبے کے واقف کار کو سپرد کی جائے گی وغیرہ وغیرہ

چنانچہ نظم نے جو کلام پیش کیا ہے اس قدر مناسب و موزوں ہے کہ اس خوبی کا اس سے بہتر تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مخالفت تو قریب قریب سبھی کر رہے ہیں مگر مخالفت کی بنیاد ہر ایک کی الگ اور اپنے رتبے اپنی حیثیت عرفی کے مطابق ہے۔ مریخ جلادِ فلک ہے، فتنوں کا سرغنہ، چنانچہ وہ اپنی مخالفت کی بنیاد بھی انسان کی فتنہ کاری ہی کو قرار دیتا ہے اور اس کا ایسا پائے کا صاحبِ فتن انسانی ریشہ دوانیوں کو پیش کر کے اپنے کانوں پے ہاتھ رکھے تو شاعر ہمیں اس نتیجے پر نہیں پہنچا رہا کہ بھئی واقعی انسان تو پرلے درجے کی آفتی مخلوق ہے بلکہ یہ پیشکش کر رہا ہے کہ مریخ کا بیان اپنے شعبے اور منصب کے لحاظ سے واقعی بہت برمحل ہے اور حسد کی کینہ توزی سے، بناوٹ اور ریاکاری سے، بالکل پاک ہے۔

یہ ہے نظم کا حسنِ بیان کہ مریخ ایسا مقرر، جس کے بارے میں کبھی کسی کے دل میں دوستی اور موافقت کا شائبہ بھی نہیں ہو سکتا، اب جو اسٹیج پے آکر گویا ہوا تو اس انداز سے کہ ہمارا دل گواہی دینے لگا کہ ہے تو دشمن مگر بات بے جا اور بے تکی اور زبردستی کی نہیں کہہ رہا۔

مگر یہ نہیں ہے اقبال کا کمال

کمال یہ ہے کہ ایسے بدباطن ہی کی زبان سے جس کی دشمنی عالم عالم ہمہ گیر ہو، عظمتِ آدم کا اعتراف کرا لیا ہے

اجی ہاں، یہ بھی کوئی اعتراف ہوا عظمت کا، کم بخت نے "چھوٹے" کا لفظ

استعمال کیا ہے۔ کہا ہے

ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار

یہ تفسیر کھلی ہوئی تحقیر نہیں تو کیا ہے؟ اسے اعتراف عظمت کیسے سمجھا جائے گا!؟

یہی تو پینچ ہیں حضور، گتھیاں ہیں، بھنور ہیں فن کے، ہنر کے، کمال کے، ان کو الٹا سیدھا سلجھایئے گا تو یہ اور الجھ جائیں گے۔ ان کو، جیسے بھی وہ ہیں، ویسے ہی، پینچ در پینچ، گرہ، در گرہ دیکھنے اور قبول کرنے کی عادت ڈالیے۔

جب حضرت ابراہیم اپنی زوجہ کو اپنی بہن کہتے ہیں تو اس کی تفسیر تو شاید آپ آسانی سے کر لیں گے لیکن جب وہ سورج اور چاند کو کہتے ہیں کہ یہ میرے خدا ہیں تو الگ سے اس کے معنی سمجھئے۔

اچھا چلئے۔ کلام الٰہی کو بھول جایئے۔ کلام بشر پے آجایئے، معروف بھی ہے، مانوس بھی۔

پڑھئے، اور کچھ نہیں تو شیکسپئر ہی کو پڑھ لیجئے، شرط یہ ہے کہ غور سے پڑھئے، کئی کئی بار پڑھئے۔ اور دیکھتے جایئے کہ کیا کثرت ہے خم در خم ایسے ہی مراحل کی۔

یاد نہیں ہے سیزر کے جنازے پے اینٹونی کا خطبۂ تعزیت؟ بروٹس، یعنی قاتلِ اول، نے خود اجازت دی ہے، دعوت دی ہے، اصرار کے ساتھ، کہ سوگ سبھا میں اینٹونی اپنے غم واندوہ کی بے قراری کا اظہار و اعلان کرے۔ اور اینٹونی؟ وہ تو گویا سیزر سے بھی سوا بروٹس کی مدح وثنا پے آمادہ ہے۔ بار بار، یہی تکرار ہے: "بروٹس عزت مآب ہیں" "حالانکہ بروٹس تو عزت مآب ہیں" "افسوس، صد افسوس، وہی بروٹس کہ جو عزت مآب ہیں....."

سمجھ گئے نا کہ یہی تعریف و توصیف کی تکرار سر تاسر مذمت، سر تاسر ملامت بن گئی ہے۔ اتنی کہ مجمع، جو ابھی پل دو پل پہلے بروٹس کی گردوں نشینی کے نعرے لگا رہا تھا، اب اس کے خون کا پیاسا بن گیا!

بھاگنا پڑا انہی "عزت مآب" بروٹس کو!

یہ تو ایک ہی پنچ ہوا بھائی۔

فسون تضاد

اب جو وقت اپنا ورق پلٹتا ہے اور آخری منظر جو پیش توجہ ہے تو ایک سلسلہ ہے معنی خیز اضداد کا اور لطف یہ ہے کہ بدیہی متوازیات نے اس ضد کی شدت کو اور بڑھا دیا ہے۔

مشابہات کو بھی دیکھئے تو بہ کثرت موجود ہیں۔ وہی اینٹونی ہے ویسی ہی شوک سبھا، ویسا ہی منظر کہ مرکز میں ایک جنازہ رکھا ہے جو موقع کی بھرپور ڈرامائیت کو ابھار رہا ہے۔ وہی زباں کا جادو اور پھر ویسا ہی سوء اتفاق کہ اینٹونی کی خطابت اپنے پورے شباب پر اس لیے پہنچی ہے کہ مقرر کو ایک بار پھر خطبۂ تعزیت کی ضرورت در پیش ہے۔ لیکن وہ خطبہ اپنے آقا کے جنازے پر تھا، یہ ہے دشمن کے جنازے پر۔

اور واہ رے ناٹک کا عجب! کہ دوست کے لیے جو آنسو بہائے وہ تماشائیوں کے لیے فلمی گلیسرین کی سی بوندیں تھیں، نمائش کے نمونے، جو تقریر کی اس کا ایک ایک لفظ آورد ایک ایک لفظ تصنع، طول پر طول کی پرتوں پے پرتیں چڑھتی جا رہی ہیں، اشتعال پر اشتعال، کیا دریائے گویائی کا دھارا ہے کہ جذبات کو بھڑکاتا ہی چلا جاتا ہے، ہجوم کو کبھی قابو میں لاتا کبھی بے قابو کر دیتا ہے۔

اور اب؟ یہاں؟

بس ایک دو جملے، دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے' اور کسی کی نہیں اینٹونی

کے دل کی۔

اور آخر میں بس ایک لفظ، اینٹونی کی خطابت کا کمال! اینٹونی کی صداقت کی روح!

آپ سمجھے؟ وہی اینٹونی جو اپنی ناٹک بازی والی معکوسیت ترک کر دیتا ہے، سقیفۂ سخن طرازی یا چبوترے یا منچ سے اتر آتا ہے اور صرف جذبۂ دل کے مخلصانہ اظہار کے لیے اپنی راست بیانی کو پل بھر پہلے کے معتوب بروٹس پر مرکوز کرتا ہے تو کوزے میں سمندر کا وہ طلسم خلق کر دیتا ہے کہ خطیبان یونان اپنی اپنی آرام گاہوں کے گوشوں میں ہمہ تن گوش بر آواز ہو جاتے ہیں اور بیان کا ہر جوڑ بند اس اختصار کا کلمہ پڑھنے لگتا ہے اس کلیمِ دوراں کی آتش بیانی کا جو عالمِ حرف و آہنگ میں ضرب المثل بن کر آج تک اقصائے زمانہ میں درخشاں اور نمونہ ساماں ہے۔

بس اب ایک آدھ ہی گھونگر باقی رہ گیا ہے اس زلف چلیپا کا۔

اینٹونی، خطیب اعظم اس ایک ڈرامے ہی کا نہیں، شیکسپیئر کے تمام عالم اعجاز و سحر کا ہی نہیں بلکہ شعر و ادب اور حرف و حکایت کے سارے سنسار کا خطیب اول و آخر

جو یہ سمجھتے ہیں کہ مرنج نے "چھوٹے" کا لفظ استعمال کیا تو اس سے مراد واقعی چھوٹا پن ہے اور بڑائی مراد ہوتی تو اس کے لیے کوئی ایسا لفظ استعمال کرتا جو "عظمت" کا ہم سر ہو- انھیں تو اس منزل پر یقین ہے کہ یہ خطیبِ ساعت و زمان صرف اپنے آقا، کشتۂ دغا، سیزر، کے لیے یہ شرف مخصوص رکھے گا کہ اپنی طلاقتِ بے عدیل کا یادگار معجزہ صرف اس شہید ستم کے قدموں پر نچھاور کرنے کے لیے مختص رکھے گا..... مگر چلتے چلتے انقلاب کی یہ عظیم الشان طرفگی دیکھیے کہ وہی مخصوص شرف، لاش پر نوحہ ماتم کا شرف، قاتلان سیزر کے عین سرغنہ کو بخشا جا رہا ہے!

اپنے تخیل کو مہمیز کیجیے، سوچیے کہ کیا اثر انگیزی اور فضا آفرینی ہے کہ مُردہ

سامنے رکھا ہے اور سو گوارد شمن خراج تحسین ادا کر رہا ہے۔

اور وہی جھوم جھوم کے اپنی شنگرف طرازی کا خود ہی لطف لینے والی زبان جو اپنے سیلِ بلاغت کی بدولت حسنِ اجمال سے بے گانہ معلوم ہوتی تھی، گویا اپنا تمام فن اپنے سارے ہنر بھول گئی ہے اور اب گویا دل کی دھڑکن ہے محض جس نے صدا کا قالب اختیار کر لیا ہے۔ وہاں تعریفوں کے پل اس لیے باندھے جا رہے تھے کہ تعریف کا مقصد تنسیخ و تردید تھا۔ یہ اب جو دل بھر آیا ہے تو مقرر کا بس نہیں چلتا کہ کلیجہ نکال کے رکھ دے اور اب اس قلزم آشنا زبان سے کلمات توصیف بخل کر رہے ہیں اور اصل قصیدہ صرف ایک جملے میں سمٹ کر رہ گیا ہے ایک لفظ پے ٹھٹک کے پورا ہو گیا ہے۔

ایک لفظ ایک عالم

خبردار! اس قلتِ کلام کی شکایت نہ کیجئے گا، کیوں کہ موقع اس وقت بولنے کا نہیں، سنجیدہ خاموشی کا ہے، ایک لفظ بھی منھ سے نکلے تو گرانی کرتا ہے، بھاری ہے ہزار ہزار بیانوں پے۔

اسی لیے تو صرف ایک جملہ!

اس لیے تو صرف ایک لفظ!!

ایک عجیب جملہ، ایک عجیب لفظ۔

سچ عرض کرتا ہوں، اتنا معمولی اور نیچی سطح کا جملہ کہ اگر مجھ ایسے دنیا کے حقیر ترین شخص کے لیے بھی وہ خراج عقیدت کے لیے استعمال کیا جاتا تو شاید مجھے کہنا پڑتا کہ بس رہنے دیجئے بندہ نواز یہ نقطے بھر کی سوتی ہوئی نوازش، اس سے تو آپ جی کھول کر کے ذرا شان و شوکت کے ساتھ میری برائی کرتے تو میری انا کو زیادہ تسکین

ہوتی۔

کیوں کہ وہ جملہ، وحدۂ لاشریک جملہ، صرف اتنا ہے: "یہ ہے ایک مرد"!

وہ لفظ، احد الواحد لفظ ہے "مرد"!!

اور اب یہ شیکسپئر یت کا کمال ہے کہ ڈرامے کی خاتم انگشتری پر پورے سیاق و سباق میں ایسی نگینے کی طرح نشست بٹھائی ہے اس ایک بے بضاعت جملے کی کہ یہی قصیدگی کی معراج قرار پائی ہے۔

وہ کیسے؟

یہ نہیں بتاؤں گا۔ کیوں کہ شیکسپئر تھوڑی ہوں۔ اور ہوتا بھی تو بتانے میں آپ کا مزا کرکرا ہو جاتا۔ آپ خود پڑھ لیجئے۔ مجھے اصرار ہے کہ مکرر پڑھئے اور پھر ذمہ ہے کہ دیکھئے لطف و تحسین کے نئے نئے دریچے آپ کے لیے کھلتے چلے جائیں گے، بصارت و بصیرت کے نئے قوس پر قوس نمودار ہوں گے اور، تقصیر معاف ہو، آپ کی نکتہ رسی کے لیے نئے باب کھلنے لگیں گے۔

بہر حال یہ تو دیکھ لیا نا کہ ایک جملے ایک لفظ میں بھی کیا بجلیاں ہیں جو بھر دی ہیں فن کار کے قلم نے۔

پھر اگر مریخ نے آدم کے لیے "چھوٹے" کی صفت استعمال کی تو آپ دل کیوں چھوٹا کریں؟

کیوں کہ آپ خود ہی سمجھتے ہیں کہ یہ کلمۂ تضحیک نہیں، کلمۂ رقابت ہے۔

مگر یہ ایک دم سامنے کی بات سمجھ کر ٹھہر جانے کا موقع نہیں۔

مان لیجئے آپ بہت بڑے گاما پہلوان ہیں اور احمد آپ کا یہ غلام ایسا نحیف و نزار گویا تنکے میں دم۔ اب یہ خادم کشتی کے فن میں آپ کی تعریف کر کے آپ کو ساتویں

آسمان پے پہنچادے تو اس سے بھلا آپ کو کون سی خوشی حاصل ہو گی؟ کوئی آپ کو بتائے حضور والا وہ جور ستم مآب افراسیابِ دوراں جناب احمد حسین صاحب ہیں نا، بڑی پرکھ رکھتے ہیں اس معاملے میں۔ وہ پہلے تو حضور کے بالکل قائل نہ تھے لیکن کل میں نے خود ان کے منہ سے حضور کی دل کھول کے تعریف سنی تو مجھے یقین آگیا آپ کے مرتبے کی بلندی کا۔ غصہ آجائے گا آپ کو ایسی اکھاڑے سے باہر کی تعریف پہ۔

اس کے برخلاف ایک حریف ہے جو درجنوں اکھاڑوں میں اکھاڑ پچھاڑ کر چکا ہے۔ وہ آپ کے لیے کہتا ہے (کم بخت کی بدکلامی کی پہلے سے معافی مانگ لوں) "سالا بڑا دم والا ہے۔ پٹ خنی بھی دیتے جاؤ، دو اور تین اور چار، کسی بھی طرف سے مگر چت نہیں ہونے پاتا" تو گالی کی یہ گستاخی بھی جو اس نے آپ کی شان میں کی اسکی دریدہ دہنی پر محمول کرنے کے بجائے، آپ کو مزا آجائے گا اس کی بات پے۔ ہاں، یہ ہے سچی، مستند تعریف، آپ دل میں کہیں گے۔

تصغیر میں تکبیر

مگر مریخ کے مصرعے میں "چھوٹے" کی صفت نسبتاً کچھ پیچیدہ ہے۔

میں یہ پرت بھی کھولنے لگا تفصیل وار تو آپ کے پاس نہ صبر ہے نہ وقت۔

بس ایک موٹی سی بات سمجھ لیجئے کہ تصغیر کے بجائے وہ انسان کی تکبیر کرتا، کہتا: ہے نیند ہی اس فتنۂ اعظم کو سزاوار

تو اس خراج عقیدت کی حیثیت کیا ہوتی؟

وہی مضمون ہے کہ مورِ ناتواں تعریف کرے بھی تو کوہِ گراں کو کیا پسند آئے گی۔

مگر یہاں جس مریخ سے اپنی ثناخوانی کرانے کی آپ کو ضد ہے وہ مورِ ناتواں قطعاً نہیں۔ اس کی حیثیت ایک شخصیت خورد، ایک فتنۂ خورد کی ہرگز نہیں ہے۔ اب

اگر اب بھی آپ "چھوٹے" ہی کے لفظ پر اٹکے ہوئے ہیں اور میرا یہ سمجھانا آپ کو واجبی نہیں معلوم ہوتا کہ تحقیر کی بات تو جانے دیجئے اس لفظ میں تو اور الٹا پیار ہے، وہی پیار جو "سالا" کی گالی میں تھا مگر ذرا دبا ہوا تھا تو پھر میں آپ کی توجہ بس اس چھوٹی سی بات کی طرف دلاؤں گا کہ بیان میں "چھوٹے" کا لفظ اسی نمایاں انداز سے آیا ہے۔ اور دوسرے لوگ اسے کیا کہتے، کیا کیا کہتے ہیں، اس سے قطع نظر، اسے خود بھی احساس اور اقرار ہے خود اپنے فتنۂ اعظم ہونے کا اس لیے فتنہ کاری کی عظمت جب اس کی اپنی ذات کے لیے مخصوص ہو تو کسی دوسرے کے لیے جو لفظ آئے گا وہ "چھوٹے" کے قبیل کا نہیں ہوگا تو اور کب ہوگا؟

یہی لفظ تو ہے جو غمازی بلکہ اعلان کر رہا ہے کہ آدم کی جناب میں یہ کسی ایرے غیرے نتھو خیرے کی جانب سے بزرگی اور اہمیت کا اعتراف نہیں بلکہ اس کی مستند اور ناقابل سوال گواہی ہے جو نہ صرف یہ کہ فتنۂ فتن ہے بلکہ جس کو اپنے کبر پر فخر و ناز بھی ہے۔ یہی چھوٹے کا لفظ تو بتا رہا ہے کہ یہ مریخ ہی کی اکیلی ذات ہے جس سے فزوں تر نو لکھا ہار برتری اور فوقیت کا انسان کے گلے میں کوئی ڈال ہی نہیں سکتا تھا۔

نہیں، بات بنی نہیں ابھی۔

کیوں کہ اقبال کے آرٹ نے خوبیوں کے خزانے بھر دیئے ہیں اس چھوٹے سے لفظ میں

اب تو سمجھے آپ میرا اشارہ "چھوٹے سے لفظ" کی معنویت کا؟

مریخ کے نخوت زدہ کردار کو براہِ راست اپنے منہ سے شیخی بگھارنے اور ڈینگ مارنے کے اسلوب میں پیش کرنے کے بجائے دوسرے فرد کے لیے "چھوٹے" کی صفت کے استعمال سے مریخ کے احساس خود پسندی کو بالواسطہ بنا دینے اور اس طرح

کلنک کے نشان کو تابش و نور کی بندیا میں تبدیل کر دینے کے علاوہ اقبال نے محاورے کا بھی بڑا خوبصورت فائدہ اٹھایا ہے۔ محاورہ نہ کہیئے، روزمرہ کہہ لیجئے یا جو نام بھی دے دیجئے عام بول چال میں اس "چھوٹے" کے استعمال کو مگر اس کی معنویت آپ نے دیکھ لی کہ خاکسار کی ترکیب تو "اس چھوٹے سے لفظ" کی تھی مگر مراد یہ تھی کہ خوبیوں کے خزانے اپنے اندر سمیٹنے کے اعتبار سے یہ لفظ چھوٹا نہیں بہت بڑا ہے۔

اور یہی عام انداز ہے ہماری بولی میں اس لفظ میں معنویت کی شدت پیدا کرنے کا۔ کہتے ہیں بچہ نہ سمجھنا اسے ارے "چھوٹی مرچ ہے بالکل"۔ اس قسم کی اور مثالیں آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں۔

تو بتایئے مرزا کا اسلوب بھی یہی نہیں ہے؟ پھر پڑھئے اور اب بتایئے:

ہے نیند ہی اس چھوٹے سے فتنے کو سزاوار

بولیے، تصدیق کرتے ہیں نا آپ میری تفسیر کی؟

اچھا جناب میں اتنے طولانی راستے کے سارے اونچ نیچ سے گزر کے آپ کو یہاں تک تو لے آیا، اب اس انتشار کو یکجا کرنا آپ پر چھوڑتا ہوں، یہ عرض کرنے کے ساتھ کہ شاعر نے اس مصرعے میں ایک نقطہ ایسا رکھ دیا ہے جو بلند و بالا کلیم کے قد کو پوری طرح ناپ بھی رہا ہے اور اس ہستی کے ماتھے پر، جو موضوع بحث ہے، یہ ایک نقطہ ستارۂ درخشاں بن کے چمک بھی رہا ہے۔ سبحان اللہ! حسنِ سخن دونوں جانب بہار دکھا رہا ہے:

اپنا بھی نام کرنا، ان کا بھی نام کرنا

بہر حال جہاں تک ہم پہنچے ہیں اس منزل تک تو حضرت آدم کو عرش بریں کی محفل سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی۔ کم سے کم یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ

گرچہ ہے کس کس برائی سے، ولے باایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

خوبیٔ تالیف

اب منزل سامنے آتی ہے نظم کی ترتیب کی

آدم کی مخالفت میں تقریروں کا سلسلہ مریخ کے بیان سے شروع کیا گیا ہے جس میں انسان کی عظمت کے لیے مقرر کا جذبہ رشک کار فرما ہے یعنی علوئے آدم کا اعتراف کیا جارہا ہے، اِس پہلو سے دیکھئے تو خفی، اُس پہلو سے دیکھئے تو جلی۔ اور مجلس کا اس نہج سے آغاز غمازی کررہا ہے کہ شرکائے بزم میں سے ہر ایک آدم کی معراجی حیثیت کا احساس رکھتا ہے اور جس نے بھی معاندانہ انداز اختیار کیا وہ اس وجہ سے کیا کہ

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ ہو جائے

اس لیے جب مریخ کی تقریر مکمل ہو چکی، آدم کی بزرگی مسلّم ہو چکی، تو اب اگر زہرہ کی باری آئی ہے تو وہ تو ہے ہی ملکۂ نخوت وناز، انسان کے متعلق جو بھی تحقیر آمیز باتیں کہہ جائے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، تنقیص وتکسیر کی جو بھی کیچڑ اچھالے دامنِ آدم کو داغدار نہیں کر سکتی۔

اور یہ بھی ترتیب نظم ہی کا نکتہ ہے، حکمت ہے سخن کی، جو مریخ کا کلام پہلے رکھا گیا ہے، زہرہ کا بعد میں کہ زہرہ کی دریدہ دہنی کو مریخ کی جانب سے در پردہ اعتراف اور مہِ کامل کی جانب سے علانیہ ثناخوانی کے درمیان سینڈوچ کر دیا گیا ہے۔ یعنی بڑی چابکدستی سے اسے گویا بے وقت کی شہنائی بنا دیا گیا یا کم سے کم ایک بے سرے راگ کی کیفیت تو ضرور پیدا کر دی گئی۔ ایسا لگتا ہے کہ ایک رواں تسلسل تھا زہرہ کی یادہ

گوئی نے اس میں گرہ ڈال دی۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک حسد زدہ حسینہ دل کے پھپھولے ضرور پھوڑتی ہے مگر اس کی دشنام طرازی قابلِ اعتنا نہیں بن پاتی۔

ترتیب کا دوسرا پہلو شاید اور زیادہ لطف کا باعث ہو۔ انجم سحر کلام کا آغاز کرتا ہے تو اس کے لہجے کا انداز ہے کہ

بہت دھیمے سروں میں ہے ابھی.....

پھر مرخ پیانو کی اور اونچی کی، یعنی کنجی یا انگشت کو دبا کر راگ کا انترا کچھ اور بلند آواز سے اٹھاتا ہے۔ آخر میں آدم کے لیے زہرہ کی بد کلامی ہے

اس کرمِک شب کور سے کیا ہم کو سروکار

جس سے اس یک رنگ راگ کا "آروھ" اپنے پورے شورو شیکھر پے پہنچ جاتا ہے۔ اس مرحلۂ تلخی پے زہرہ کا لہجہ اتنا کرخت ہو جاتا ہے کہ پورے راگ کا انداز ہی بدلا ہوا معلوم ہونے لگتا ہے جس سے کچھ ایسا تاثر پیدا ہو جاتا ہے کہ گویا پچھلی لے بھی ایک زمزمۂ شورش ہی تھی شاید۔

وہ انگریزی کی ایک مثل ہے نا کہ جب کوئی بڑا حادثہ پیش آتا ہے تو آگے ہی نہیں پیچھے بھی اپنا سایہ ڈالنے لگتا ہے۔ ابھی تک جو سلسلہ چل رہا تھا اس کا کچھ سبزی کا سا انداز تھا لیکن اب جو زہرہ نے ایسے کڑوے بول بولے تو اس رنگ میں سیاہی کا کاجل بھی ملا دیا اور معلوم ہونے لگا کہ پہلے بھی یہ رنگ سبز زمرد اور نیلم نہیں بلکہ شروع سے کچھ دھانی دھانی سا تھا۔

آپ کہیں گے واہ صاحب واہ، انجم سحر کی طرفداری میں تو آپ ابھی اتنی لمبی چوڑی حاشیہ آرائی کئے ڈال رہے تھے، کہہ رہے تھے اسے زمین سے اور اس کے باسی انسان سے ایک فطری لگاؤ ہے اور اس کے سوال میں اثبات کی ایک آرزو دبی ہوئی ہے، انکار کا طعنہ نہیں، اور اس کی گویائی کی زیادہ سے زیادہ مخالفانہ تعبیر بس اتنی ممکن

ہے کہ وہ محض تجسس ہے، بے تعصب خیر خواہی کا۔

اور اب آپ اس بندش میں کاجل کی سیاہی دیکھنے لگے، بلکہ اس سرگم میں صدائے انجم سحر کو بھی شامل کرلیا۔

نہیں، ایسا نہیں ہے۔ انجم سحر کے بارے میں جو کچھ مطبوع اور موافقانہ گفتگو ہوئی اس کی تردید و تنسیخ نہیں کی جارہی۔ صرف یہ کہا جارہا ہے کہ انسان سے زہرہ کی بیزاری نے ایک اور رنگ چڑھادیا سابق کی پوری تصویر پے۔ الگ الگ ان کی حیثیت نہیں بدلی لیکن اب مجموعی طور پے اس پے ایک ناموافق تاریکی کی پرچھائیں پڑنے لگی ہے۔

سایہ گزیدہ

اور آپ تو مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اہل تنقید اسی کو آرٹ کہتے ہیں۔ یہ کوئی منطقی دلیل بازی کا معاملہ تھوڑی ہے کہ کیوں بھئی ابھی تو تم نے یہ گواہی دی اور اب تم بالکل پلٹ گئے۔ بلکہ وہاں بھی سر سید احمد خاں کے صاحبزادے سید محمود کے ایسے کسی چرب دماغ کو ضرورت پڑ جاتی ہے تو وہ پہلے غلطی سے تمام فریق مخالف کے دلائل دینے کے بعد جو چونکتا ہے تو خود اپنی ہی منطق کو نکتہ بہ نکتہ رد کرتا چلا جاتا ہے اور شعر وادب میں تو ایسی مثالیں کثیر سے بھی زائد ہیں کہ جو بات ابھی شدومد سے پیش ہوئی تھی اپنی ہی ضد بن جاتی ہے۔

یہاں بھی شاعر کا یہی اہتمام ہے۔ پہلے جو شیشے آئے تھے ان سے دیکھا تو انسان کا حسن جھلک رہا تھا۔ اب ایک اور بے درد آئینے نے چہرے کے خدوخال بدلے بھی نہیں پر روپ کی سب سے بڑی بدنمائی کی چغلی کھا کر دکھادیا کہ اس عیب کے نقش تو پہلے سے بھی ہر ایک عکس میں موجود تھے اگرچہ وہ نمایاں نہیں تھے۔

اور وہ عیب کیا ہے؟

یہ کہ انسان "شب کور" ہے اور اس بہانے سے زہرہ نے اسے "کرمِک شب کور" بنادیا، مگر یہ خامی مفقود پہلے بھی کسی گفتگو میں نہیں تھی۔ اور بھی مقررین آدم کا ذکر کر رہے تھے تو شب خوابی کا یا تو بے دریغ ذکر تھا یا محض اشارہ لیکن اغماز کسی نے نہیں کیا تھا اس امر سے اور اس وقت بھی ذکر یا اشارے کا کیا ذکر بے دھڑک ملامت ہے کہ رات کے اندھیرے میں اسے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔

یہ نہ سمجھئے گا میں زبردستی خارج سے نظم پر اپنی تفسیر چسپاں کئے دے رہا ہوں ورنہ اقبال نے تو نجم سحر مریخ اور زہرہ تینوں میں سے ہر ایک کا موقف بالکل الگ رکھا ہے اور بے میل۔

بالکل الگ یقیناً رکھا ہے لیکن بے میل نہیں۔

اقبال نے تینوں کے الگ الگ راگ کو ایک مشترک کورس میں بھی پرویا ہے جب انھوں نے تینوں کے لیے "کہا" یا "کہنے لگا" کا فعل استعمال کر کے چاند کے لیے استعمال ہونے والے فعل "بولا" سے پہلے والے کورس کو صاف اور معنی خیز طور پر ممیز کر دیا۔

خیر یہ تو سب ہے لیکن زہرہ کے بیان سے اقبال کے 'دل کا چور' بھی پکڑا گیا۔

پھر یاد دلادوں کہ یہ "دل کا چور پکڑا گیا" والی اصطلاح میں نے مذمت میں نہیں محبت میں استعمال کی ہے۔

ابھی تک ساکنانِ فلک میں جو بھی باتیں ہوئیں ان کا مشترک مبحث رہا ہے آدم کی خوابیدگی۔ زہرہ نے اسے رات کو سوتا دیکھا تو یہاں تک کہہ دیا کہ انسان کیا اندھا نپٹ کیڑا ہے کم بخت! مریخ نے بھی اسے نیند ہی میں غلطاں پایا اور بیدار و ہشیار تو انجم سحر نے بھی نہیں دیکھا۔ یہ جو برائیاں یا چہ می گوئیاں ہو رہی ہیں، شک و شبہ کا اظہار

کیا جارہا ہے، سوال پیدا ہو رہا ہے، یہ سب اس لیے کہ مذاکرے کے وقت انسان سرمست و بے ہوش ہے۔

یہی نہیں، چاند بھی اپنے قصیدے کی شرط "لذت بیداریٔ شب" پہ منحصر کرتا ہے۔

اس سے ملتا ہے اقبال کی اپنی افتادِ طبع کا واضح اشارہ۔

سحر خیزی کوئی پوشیدہ یا بعید شعری یا دینی یا محض خیالی آدرش نہیں ہے ان کے لیے بلکہ سچ مچ ان کا مروجہ عمل ہے، ایسی راسخ عادت ہے کہ لندن کے "زمستانی" موسم میں بھی، جب سردی کے تیر اون کی تہ بہ تہ زرہ کو توڑتے ہوئے اندر ہڈیوں تک کو گھائل کر دیتے ہیں، اقبال نے یہ سعادت ترک نہیں کی۔ بالکل انہی الفاظ میں کہتے ہیں:

زمستانی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آدابِ سحر خیزی

اپنے آدم کے لیے یہ ادا ان کو اس قدر پسند ہے کہ اس طرح کے مضمون کے شعر بال جبریل ہی میں نہیں بانگ درا میں بھی جا بجا بکھرے ہوئے ہیں۔

نہ چھین لذت آہ سحر گہی مجھ سے

ساقی نامہ میں دو شعر قریب ہی قریب موجود ہیں۔

ترے آسمانوں کی، تاروں کی خیر زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
مرے نالہ نیم شب کا نیاز مری خلوت انجمن کا گداز
تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی مری دنیا فغانِ صبحگاہی

کبھی حیرت کبھی مستی کبھی آہِ سحر گاہی
بدلتا ہے ہزاروں رنگ میرا دردِ مہجوری

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو　　کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی
سکوت شام سے تا نغمۂ سحر گاہی　　ہزار مرحلہ ہائے فغانِ نیم شبی

کثرتِ اشعار ہی سے اندازہ ہو رہا ہے کہ کتنا محبوب ہے یہ طریق، کتنا عزیز ہے یہ موضوع ان کو۔

زیر بحث نظم میں بھی سحر خیزی کی برکت اور فغان صبح گاہی کی سعادت کے لیے اقبال کی فصاحت کے سوتے اس طرح پھوٹ نکلے ہیں کہ جب تک اختتام تک نہ پہنچئے شبہ سا رہتا ہے کہ نظم کا مرکزی موضوع سحر خیزی ہے یا اذان

واقف ہو اگر لذت بیداریٔ شب سے
اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاکِ پر اسرار

اچھا اک بات بتایئے۔

یہ شعر جو ابھی آپ نے پڑھا اس کے بعد ایک اور شعر آتا ہے اور پھر شاعر نفس مضمون پے پہنچ جاتا ہے:

ناگاہ فضا بانگ اذان سے ہوئی لبریز

اب وہ بیچ کا شعر کیا ہے؟ وہ ہے:

آغوش میں اس کے وہ تجلی ہے کہ جس میں　　کھو جائیں گے افلاک کے سب ثابت و سیار

تو پھر ترتیب کیا ہوئی؟ پہلے "واقف ہو اگر لذت بیداریٔ شب سے۔" پھر "آغوش میں اس کے وہ تجلی ہے کہ جس میں" اور اس کے بعد آمدم بر سر مطلب یعنی "ناگاہ....." ۔ اب اس ترتیب پہ ایک بار اور نگاہ ڈالئے اور بتایئے یہ بیچ کا "آغوش" والا شعر یہاں کیا کر رہا ہے؟ کچھ بے ربط نہیں معلوم ہوتا آپ کو؟ سیاق و سباق سے جو اصل دھارا بنتا ہے نظم کا یہ شعر اس سے کچھ باہر نہیں ہے؟ کیوں کہ سابقہ تو تمام تر سحر

جزری ہے متعلق ہے، اور لاحقہ ہے اذان۔ تو پھر یہ "آغوش میں..... تجلی۔" کہاں سے آگئی؟ اس کا تو کوئی ذکر اذکار کہیں تھا ہی نہیں۔

سبحان اللہ! بس ایسے ہی موقعوں پر تو کھلتی ہے حقیقت اقبال کے فن کی۔

اگر بات یہیں پے ختم ہو جاتی کہ "اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پراسرار" تو ہم کہتے: مان لیا آدم کا مقام ثریا سے بلند سہی، وہ بھی قطعاً مشروط، تو کون بڑا تیر مار لیا میاں جی نے پھر بھی!؟

ہر مرغ کی ایک ککڑوں کوں

اور بس، اس کے بعد وہ اذان والا شعر آجاتا۔ تو اب نکتہ رسی اندر سے معترض ہوتی کہ بھئی یہ بات تو اچانک سی ہو گئی کچھ۔ اور نظم کا نقشہ کیا ہوتا؟ بس یہی کہ جیسے اور تینوں نے اپنا اپنا ڈائیلاگ بول دیا چاند نے بھی اپنا مقررہ پارٹ پورا کر لیا پھر جناب اذان ہو گئی۔ مطلب یہ کہ سدھی بدھی تھی ستاروں اور چاند اور حضرت موذن میں اور اذان بھی اس مکالمے کے ذیل میں آگئی۔ یعنی؟ اس کی حیثیت بھی ذیلی ہو گئی!

اور حضور جب سارے اداکاروں کا مکالمہ پہلے سے مقرر تھا تو یہ "ناگاہ" کہاں سے وارد ہو گیا؟

ناگاہ کا کیا موقع رہا؟ سب بولنے والے بول چکے تین ایکسٹرا تھے، ان کا ایک ایک شعر، چاند سیکنڈ ہیرو، اسکے دو۔ وہ بھی اپنا لیکچر جھاڑ کے خاموش ہو گیا تو بس کھلاس۔ کٹ۔ وقفہ۔ موذن نے چونک کر سوچا "او گوڈ! اب میری باری ہے!؟" چنانچہ اے لیجئے اس کی بھی صدا بندی "لبریز ہوئی اب جو فضا بانگ اذان سے" تو "بس رہ گیا اس نعرے سے ہل کر دل کہسار!"

"اہاہا، واہ وا، کیا خوب نظم کہی ہے" ملا جی فرماتے، کیوں کہ اذان کا نام آگیا نا۔ اذان بلند ہوئی نظم اچھی ہے، نہیں تو بے کار۔ قوالی کچھ سمجھ میں نہیں آرہی تھی مگر

جب پتہ چلا کہ غزل کس کی ہے تو فرمایا

گالب نے کئی ہے تو کھوب کئی ہے۔

لیکن اگر ہمارے پاس دونوں آنکھیں یا ایک آنکھ بھی بصیرت والی موجود ہے تو نظم اپنی اقبالی صورت میں حسین سے حسین تر معلوم ہو گی جیسے وہ فراز سے فراز تر کی جانب بلند ہوتی جائے گی۔

پھر ملاحظہ کیجئے، ترتیب ہی نہیں تدریج کو بھی، اقبالی ترتیب اور اقبالی تدریج کو۔

مہ کامل نے ایسی مجلس کو جس میں اکثریت فساد آمادہ ارکان کی تھی پیار اور نرمی سے سمجھایا ہے کہ ننھے دوستو، انسان کو تمہارے مقابلے میں جو امتیاز حاصل ہے سب سے پہلے تو اس کو پہچانو، پھر اس کی شب خوابی کی طرف اشارہ کیا ہے اور جزوی طور پے اس کا اقرار تو کیا مگر اسی پردے میں انسان کی عظمت کی داستان کو بلندیٔ تمام کی معراج پر پہنچا دیا ہے۔

اونچی ہے ثریا سے بھی یہ خاک پر اسرار

مراد یہ ہے کہ تمہیں اپنی فلک نشینی ہی پے ناز ہے نا، اب دیکھو وہ فلک الفلاک سے بھی اعلیٰ وارفع ہے۔ مہ کامل کے لہجے کی خود اعتمادی کہہ رہی ہے کہ میں گیتی نگراں بھی ہوں اور گردوں شناس بھی، اس لیے پست و بلند دونوں کی حقیقت تم سے بہتر سمجھتا ہوں اور اسی بنیاد پر رموزِ آدم تم پر کھول رہا ہوں.....

نہیں ابھی نہیں

بس اب آگے جو نکتہ ہے بہت لطیف اور بہت لطف لینے کے قابل ہے۔

پہنچ گیا کیا مہِ کامل کا خطبہ اپنی منزل شباب پر؟ نہیں، ابھی نہیں۔

ابھی تک تو اس کی قصیدہ خوانی میں بیداری اور خوابیدگی کا جھنجٹ ستایشِ بے حد کی راہ میں حائل تھا مگر اب جو تفہیم و تشریح کا باب پورا ہو گیا تو اس کی طلاقتِ

گویائی ایک قلزم ایک طغیان بن کے رواں ہو گئی۔

جانے دو سونے جاگنے کے عذر کی بنا پر تکسیر آدم کے یہ طریقے۔ تم، جو اس وقت ایک تھوڑی سی تعداد میں یہاں جمع ہو صرف اپنی موجودہ اور محدود محفل کا خیال نہ کرو، بلکہ اپنی ساری کی ساری جمعیت کو لے لو ہزاروں نہیں، لاکھوں نہیں، کروڑوں کی تعداد میں، پھر اب بتاؤ کہ حقیقت کیا ہے تمہاری، روشنی کے چھوٹے چھوٹے نقطے ہونا؟ کچھ پورے تو کچھ ادھورے، ثابت ہو چاہے سیار۔

اور آدم کیا ہے تمہارے مقابل؟

تجلی ہی تجلی نور ہی نور

ارے ایسا بحر بے کراں ہے آدم نورانئ فراواں کا کہ تم لوگ، سب کے سب، فلک الفلاک میں ہر آسمان کے، آفاق کے ہر ایک برج، ہر ایک سپہر کے، اس کی چکاچوند میں ماند پڑ جاؤ گے، کھو جاؤ گے، معدوم ہو جاؤ گے۔

اور عزیزو یہ کچھ آج کی بات نہیں ہے۔ میں نہ کثرت کو محدود کر رہا ہوں نہ وقت کو۔ عصر رواں سے آگے جہاں تک بھی تمھارا خیال جائے وقعت آدم کو فزوں سے فزوں تر ہی پاؤ گے۔ یہاں تک کہ جب ابد کا دھندلکا چھا جائے گا تو آدم کی شمس فگن نورانیت کا یہ عالم ہو گا کہ بس گویا ایک سمندر جوش پر ہے اور کہ ومہ کو، ہاں میں اپنے آپ کو بھی شامل کر کے کہہ رہا ہوں، کہ کہہ ومہ سب کو حقیر تنکوں کی طرح بہائے لیے جا رہا ہے!

مہِ کامل نے تمام حدیں منہدم کر دیں، خوابیدگی اور بیداری کی حدیں، بلندی و پستی کی حدیں، تاریکی و تابندگی کی حدیں اور حیات کی تنگی کی حدیں۔

اور اب آتا ہے وہ مقام جو نظم کا سب سے دل پذیر نقطہ ہے۔

بھولیئے نہیں، مہِ کامل کا خطبہ ابھی تمام نہیں ہوا، محفل منتشر نہیں ہوئی۔
قصیدہ اپنے فصلِ فراز کو طے کر کے ابھی نشیب کی جانب اترنا بھی نہیں شروع ہوا بلکہ شان و شوکت میں جوش سے جوش کی جانب بڑھتا ہی جارہا ہے۔
نہ موضوع کی وسعت میں کوئی تنگی نہ خطیب کے حوصلے کی بلندی میں۔
اللہ کرے زورِ بیان اور زیادہ، اور زیادہ، اور زیادہ
..... کہ بس بیچ ہی میں۔ایک دم.....
جی ہاں، اب یہ موقع ہے کہ آپ کی زبان پر خود بخود "اچانک" کا لفظ جاری ہو جائے۔
اقبال شاعر ہیں، ان کے قلمِ موزوں رقم نے "ناگاہ" رقم کر دیا۔
ابھی تک تو قصیدہ خوانی میں فتنہ پردازی و امن پروری کی قسم کی الجھنیں بے تکلف مدح کی راہ میں حائل تھیں، مگر اب جو تقریر اپنے نقطہ شباب پر پہنچی تو اس کے خلوص کی برکت سے آفاق میں عروج اعلیٰ کا باب بھی کھل گیا اور بس.....

ناگاہ فضا بانگِ اذاں سے ہوئی لبریز

بر محل مطابقت کا کیا گنج گراں مایہ ہے جو اس ایک لفظ "ناگاہ" میں سر بہ مہر کر دیا گیا ہے!
مگر اس لفظ سے دھوکا نہ کھایئے گا۔ یہ نہ سمجھئے گا کہ اس بانگ بلند آہنگ نے مہِ کامل کی بات کاٹ دی۔ جی نہیں، پوری کر دی! وہ نہ جانے اپنے ممدوح کی شان میں ابھی اور کیا کیا کہتا، کس کس طرح اپنے دل کی حسرت نکالتا، القا و بیان کے کیا کیا سحر آفریں جادو جگاتا.....
جو دفعتاً اس کی تمام سعیِ ریاضت مشکور ہو گئی، فصاحتِ مطلق نے چشم زدن

میں تمام ممکنہ مدارج طے کر لیئے اور چاند کے چہرے پر تبسم کھِل اٹھا کہ اذان سے بہتر شرحِ عظمت آدم اور کیا ہو گی۔

چاند کے کلمات میں اثر کی کمی نہ تھی، دل پذیری کا فقدان نہ تھا، پھر بھی انجام کار ستارے مانتے یا نہ مانتے لیکن اذان کے کلمہ ٔ قطعیت سے بڑھ کر اور کوئی شہادت علوئے آدم کی اور کیا ہو سکتی تھی اور اب ستاروں کے لیے بھی اقرار کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔

ان کی صحبت انکار درہم برہم ہو گئی آخر اذان کے ساتھ
جاتے جاتے انجمِ سحر کو بھی اپنے سوال کا جواب مل گیا
جواب باثواب و خوش صواب
مطمئن و مسرور، رُوپوش ہو گیا وہ اپنی فرودگاہِ صباحت میں۔

اپنی ناشکیبائی کو کیا کروں

مگر راقم کو منزل پے پہنچ کے بھی اطمینان و سرور کی فرودگاہ نصیب نہیں۔

اس کا قلبِ ناشکیب آرزو کر رہا ہے کہ کاش یہ آواز پہاڑوں کا دل دہلانے کے علاوہ بلکہ اس کے بجائے بیداریٔ آدم و عالم اور تحریکِ جنبشِ حیات کی صدائے خوش نوا بن کر بھی پیش ہوتی۔